بسم اللہ الرحمن الرحیم

تعمیرِ حیات لکھنؤ

پندرہ روزہ

ISSN 2582-4619

جلد نمبر ۶۳ ۲۵؍جنوری ۲۰۲۶ء مطابق ۵؍شعبان المعظم ۱۴۴۷ھ شمارہ نمبر ۶

اس شمارے میں

نئی تہذیب	اکبرؔ الٰہ آبادیؒ	۴
مدرسہ، طلبہ اور وقت کی ضرورت	محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی	۵
تفسیر سورۂ فاتحہ	حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی	۷
اللہ تعالیٰ کی شان	عبدالرشید راجستھانی ندوی	۹
ہندوستان کا سیکولر و جمہوری چہرہ	انیس احمد ندوی	۱۰
نصابی تعلیم اور ہم نصابی سرگرمیاں	محمد مستقیم ندوی	۱۲
اخلاقی طاقت اور عالمی قیادت	ڈاکٹر محمد وثیق ندوی	۱۴
اسلام میں مساواتِ مرد و زن کا تصور	منور سلطان ندوی	۱۶
فطرت سے بغاوت: جدید تہذیب کا المیہ	ڈاکٹر محمد اعظم ندوی	۱۸
ندوہ کے رسائل و جرائد ۔ ادبی و فکری تناظر میں	زین العابدین ہاشمی ندوی	۲۰
تعلیم کا مقصد ۔ خدمتِ خلق نہ کہ خدمتِ ذات	محمد ناظم اشرف ندوی	۲۲
عربی زبان: آفاقیت اور عصری معنویت	ڈاکٹر محمد فرمان ندوی	۲۴
فرض شناسی: فلاح کی شاہ کلید	محمد جاوید اختر ندوی	۲۷
تعارف و تبصرہ	محمد اصطفاء الحسن ندوی	۲۸
چنگیزیت کے بدلتے روپ	محمد نفیس خان ندوی	۳۰
ندوۃ العلماء ۔ منزل بہ منزل	محمد زین الحق ندوی	۳۲
سوال و جواب	مفتی محمد ظفر عالم ندوی	۳۳

سرپرست

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی

(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر مسئول

شمس الحق ندوی

نائب مدیر

محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

معاون مدیر

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی

محمد نفیس خان ندوی ❁ محمد جاوید اختر ندوی

مجلس مشاورت

مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی ❁ مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی

قارئین محترم! تعمیرِ حیات کا سالانہ زرِتعاون ذیل میں دیے گئے اکاؤنٹ میں جمع کرائیں!

TAMEER E HAYAT

A/c. No. 10863759868 (Current A/c.)

IFSC Code : SBIN0000125 – Swift Code : SBINNB157

State Bank of India, Main Branch, Lucknow

براہِ کرم رقم جمع ہوجانے کے بعد دفتر کے فون نمبر یا ای میل پر خریداری نمبر کے ساتھ اطلاع ضرور دیدیں۔

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ

TAMEER-E-HAYAT

Tagre Marg, Badshah Bagh, Lucknow - 226007, Call : 9559844716

website : http://tameerehayat.com - email : tameer1963@gmail.com

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

سالانہ زرتعاون -/500	فی شمارہ -/25	ایشیائی، یورپی، افریقی و امریکی ممالک کے لئے۔ $100

ڈرافٹ منیجر تعمیر حیات کے نام سے بنائیں اور دفتر تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر روانہ کریں۔ چیک سے بھیجی جانے والی رقم صرف All CBS Payable Multicity Cheques روانہ فرمائیں، بصورت دیگر ₹30/= جوڑ کر چیک دیں۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیں۔

آپ کی خریداری نمبر کے نیچے اگر سرخ لکیر ہے تو سمجھیں کہ آپ کا زرتعاون ختم ہوچکا ہے، لہٰذا جلد ہی زرتعاون ارسال کریں۔ اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، موبائل یا فون نمبر اور پتے کے ساتھ پن کوڈ بھی لکھیں۔ (منیجر تعمیر حیات)

پرنٹر پبلشر محمد طٰہٰ اطہر نے آزاد پرنٹنگ پریس، نظیر آباد، لکھنؤ سے طبع کرا کے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت و نشریات ٹیگور مارگ، بادشاہ باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

شعروادب

نئی تہذیب

اکبرؔ الہ آبادیؒ (سید اکبر حسین رضوی)
(۱۶/نومبر ۱۸۴۶ء-۹/ستمبر ۱۹۲۱ء)

یہ موجودہ طریقے راہیٔ ملکِ عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے

عقائد پر قیامت آئے گی ترمیمِ ملت سے
نیا کعبہ بنے گا، مغربی پتلے صنم ہوں گے

نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی
نہ ایسا پیچ زلفوں میں، نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے

بہت ہوں گے مغنی نغمۂ تقلیدِ یورپ کے
مگر بے جوڑ ہوں گے اس لیے بے تال وسم ہوں گے

نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردے کی یہ پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہوں گے

ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوگی
لغاتِ مغربی بازار کی بھاشا سے ضم ہوں گے

بدل جائے گا اندازِ طبائع دورِ گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسبابِ غم ہوں گے

بدل جائے گا معیارِ شرافت چشمِ دنیا میں
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے

نہ پیدا ہوگی خطِ نسخ سے شانِ ادب آگیں
خبر دیتی ہے تحریک ہوا تبدیل موسم کی کھلیں گے

گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے
کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ وحشم ہوں گے

اور ہی گل زمزمے بلبل کے کم ہوں گے
نہ نستعلیق حرف اس طور سے زیبِ رقم ہوں گے

کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا، نہ غم ہوگا
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر وبم ہوں گے

تمھیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبرؔ
بہت نزدیک ہیں وہ دن کہ تم ہوگے، نہ ہم ہوں گے

اداریہ

مدرسہ، طلبہ اور وقت کی ضرورت

محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

عربی اور دینی مدارس کے تعلیمی سال کا اختتام‘ ان دنوں کے زیرِ سایہ ہوتا ہے جن کے دامن میں توبہ و برأت کی وہ رات ہے‘ جس کے بابرکت ہونے پر امت کے ایک بڑے طبقہ کا اتفاق ظاہر کیا جاتا ہے۔ روایات کے مستند اور قابلِ قبول ہونے میں اظہارِ خیال کا دائرہ کتنا ہی وسیع اور مختلف الجہات ہو‘ اتنا تو طے ہے کہ رمضان المبارک کے استقبال اور اس کی برکتوں کی نوید اور انسانوں کو قرآن مجید جیسے عظیم ترین تحفہ سے سرفراز ہونے کے دنوں کی قربت سے شعبان کا یہ امتحانی زمانہ‘ دینی طالب علموں کی نیت اور محنت کو کچھ الگ ہی عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جانے کا مطالبہ کرتا نظر آتا ہے۔

مدارس کا وجود کیوں؟ ان کی ضرورت‘ زمانہ کے ماحول اور تقاضوں کے پیشِ نظر کس درجہ کی؟ ایسے سوالات‘ اسلام میں مدرسوں اور ان کی تعلیم و تدریس و تربیت کے بارہ میں گذشتہ زمانوں میں اتنے نہیں کیے گئے جتنا ایک صدی یا ڈیڑھ صدی قبل‘ دنیا کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی انقلابوں کی ہلچل نے پیدا کردیے۔ جدید ذہنی و فکری انقلابات نے تعلیم کو معاش سے اس طرح جوڑا کہ علم و فکر کا نہج ہی نہیں مقصد بھی کچھ سے کچھ ہو گیا۔

دنیا کے ان نئے انقلابوں کا ظاہر جو بھی رہا ہو‘ ایک مقصد سب میں شامل رہا، اور وہ تھا علم اور انسان کے رشتوں کی الٰہیاتی پہچان کو مسخ کرنا، اور علمِ جدید کا ایسا شور پیدا کرنا جس میں خدا اور اس کی کائنات کی آوازیں دب کر رہ جائیں۔ علم کی روح اور علم کے ضمیر سے دست برداری کا یہ جدید تعلیمی نظام‘ دراصل وہ غیر منطقی نظام تھا جس میں انسان کی زندگی کو جانوروں کی زندگی کی طرح انجام اور عاقبت جیسے الفاظ سے بیگانہ کرنا تھا۔ اسی لیے اس فکر کا سب سے بڑا نشانہ وہ تعلیمی نظام بنا جس کی پہچان روح اور ضمیر اور انسانی کمالات و خصائص کی تعمیر و ترقی سے تھی۔

دینی تعلیم گاہوں کا معاملہ اس لیے اور مذہبوں کی دینی درس گاہوں سے جدا سمجھا گیا کہ یہاں سمجھوتوں کا معاملہ ہی نہیں تھا، اور یہ اس لیے نہیں تھا کہ اسلام نے علم کو مادہ اور روح کی ثنویت اور دوئی میں دیکھنے کا نظریہ ہی نہیں دیا۔ علم الاسماء کی عمومیت میں اشارہ ہی نہیں‘ وضاحت و صراحت کی کمی نہیں کہ اصل کامیابی و کامرانی پیش نظر رکھ کر یہ دنیا جس نصاب کے لیے امتحان گاہ بنائی گئی ہے وہ صرف خیر اور نافع ہونے کا نصاب ہے۔ اسی لیے تعلیم کی دنیا میں قصہ قدیم و جدید کا گزر ہی نہیں۔ قریب ایک سو دس سال پہلے ایک آواز جدید تعلیم کے سحر میں گرفتاروں کے لیے اور ان سے بھی زیادہ دینی تعلیم کے مستقبل کے بارہ میں مشکوک ذہنوں کے لیے ندوہ کے دل سے نکل کر زبان پر اس طرح آ گئی کہ اسلام ایک بلند حوصلہ اور بلند نظر مذہب ہے، جس کے لیے ایک مخصوص تربیت کی ضرورت ہے، جو اس کے مقتداؤں میں بلندیٔ حوصلہ، استغنائے طبع اور وسعتِ نظر پیدا کردے، وہ اخلاقِ عالیہ کا بہترین نمونہ ہوں۔ یہاں ''مقتدائے اسلام'' کے الفاظ‘ طالبینِ علوم نبوت کے لیے بہت سوچ سمجھ کر استعمال کیے گئے۔ جن کی نظریں مظاہر سے زیادہ حقائق پر رہتی ہیں‘ وہی جانتے ہیں کہ اسلام میں علماء کا لفظ اس جماعت کے لیے خاص ہے‘ جس کی اقتداء ملت اور قوم کا فطری اقتضاء ہے۔ یہی وہ علماء ہیں جن کی شناخت حوصلوں کی بلندی، طبیعت کی بے نیازی اور نظر کی وسعت سے ہوتی ہے۔ دل و نظر کی پاکی، صفائی اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی زبان میں تنزہ‘ علماء کی خاص صفت‘ زمانہ سلف میں رہی، اور یہی دورِ جدید میں بھی مطلوب و مقصود ہے۔ یہ وہ خوبیاں ہیں جن کے بغیر کوئی انسان کسی معاشرہ میں شرکت نہیں کرسکتا، نمائندگی کرنا تو دور کی

بات ہے۔ دینی طالب علم محض ایک طالب علم نہیں، اس کی اصل پہچان، اسلام کے داعی کی ہے، جو ایک مثالی انسانی معاشرہ کی ضرورت ہے اور اسی لیے مطلوب بھی۔ اس لیے داعی کو مذکورہ خوبیوں اور خصوصیات کا حامل ہونا ہی ہوتا ہے۔ قریب ایک صدی قبل دین کے طالب علموں میں اگر ان خوبیوں کی کمی کا احساس تھا تو ندوہ اسی احساس کو زندہ کرنے اور اس کے نتیجہ میں مطلوب علماء کے وجود کی ایک آواز بن گیا۔ بغیر کسی ادعا کے، بغیر کسی مقابلہ آرائی کے، صرف شکر کے یہ الفاظ زبان پر آئے یا لائے گئے، کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی جماعت پیدا کردی جس نے قوم کے اصل مرض کی تشخیص کی اور علاج تلاش کیا۔ ایسے علماء پیدا کیے جو موجودہ میدان میں کام آسکیں، ایسے طبیب تیار کیے جو موجودہ امراض میں کارآمد ہوسکتے ہیں۔ کیسی پیاری بات کہی گئی کہ ندوہ اور دارالعلوم کا صرف وہی کام نہیں ہے جو اس کے احاطۂ عمارت میں ظہور پذیر ہو۔ وہ تمام کام ندوہ اور اس کے دارالعلوم ہی کا کام ہے جو اصلاح کے نام سے دنیا کے ہر عربی اور مذہبی مدرسہ میں رونما ہو۔

شعبان کے مہینہ میں مدارس میں امتحان کے مرحلوں سے گذرنے والوں کو حقیقی کامیابی کا لطف جب بھی ملے، اس وقت تو امتحان کے ساتھ بزرگوں کی باتوں کا استحضار کچھ کم نعمت نہیں۔

☆☆☆

آل انڈیا ملی کونسل کے جنرل سیکریٹری

ڈاکٹر محمد منظور عالم نہیں رہے

۱۳/جنوری ۲۰۲۶ء کو منگل کی صبح ہندوستانی مسلمانوں کے ایک ملی رہنما محترم جناب ڈاکٹر محمد منظور عالم رحمہ اللہ تعالیٰ کی وفات کا سانحہ پیش آیا، اناللہ و إنا إلیہ راجعون۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی مختلف میدانوں میں عملی جد و جہد سے عبارت تھی۔ گرچہ ان کا موضوع معاشیات تھا؛ لیکن انھوں نے فکری، ملی، قومی، سماجی، سیاسی، صحافتی اور تعلیمی میدانوں میں بڑی خدمات انجام دیں۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کی پیدائش مدھوبنی، بہار میں ۹/اکتوبر ۱۹۴۵ء میں ہوئی۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور 'معاشیات' میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے سرفراز ہوئے۔ وہ آل انڈیا ملی کونسل کے جنرل سکریٹری ہونے کے ساتھ ملک و بیرونِ ملک کے کئی اہم اداروں سے وابستہ رہے، اور اپنی خدمات سے فائدہ ان کو پہنچایا۔ انھوں نے 'انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز' کی بنا ڈالی، سعودیہ کے وزارتِ مال کے مشیر رہے، جامعۃ الامام محمد بن سعود میں استاذ مشارک کی حیثیت سے کام کیا، مجمع الملک فہد برائے نشر و اشاعت میں شعبۂ ترجمۂ قرآن کے چیف کوآرڈی نیٹر کے طور پر کام کیا، ملیشیا کی اسلامک یونیورسٹی میں ہندوستان کی نمائندگی کی، اسلامک بینک فار ڈیولپمنٹ کے تعلیمی وظائف کی کمیٹی رکن رہے، محمد بن سعود یونیورسٹی ریاض کے شعبۂ اسلامی معاشیات میں ایسوسی ایٹ پروفیسر رہے، اسلامک بینکنگ، فکرِ اسلامی اور مالی تعاون کے کئی بڑے ملکی اور غیر ملکی اداروں میں مختلف عہدوں پر رہتے ہوئے اپنی خدمات پیش کیں، مسلم پرسنل لاء بورڈ کے رکن کی حیثیت سے بھی کام کیا۔

ڈاکٹر منظور عالم قوم و ملت اور وطن کے ایک ہمدرد انسان تھے۔ انھوں نے بالخصوص ہندوستانی اقلیات پر بڑا کام کیا، ان میں فکری شعور اور سیاسی آگہی بیدار کرنے میں اپنا کردار ادا کیا، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز کے قیام کے تحت ان کا بنیادی مقصد ہندوستانی اقلیات کے مختلف مفید پہلوؤں سے تفاصیل جمع کرنا تھا، جس کی روشنی میں ان کے لیے راہِ عمل طے کی جاسکے، اور ان کی بقا کو یقینی بنانے کی کوشش کی جاسکے۔ مرحوم کا تعلق چونکہ کئی مالی تعاون کے اداروں سے بھی رہا، اس تعلق سے انھوں نے ہندوستان میں بالخصوص مدارس و مساجد کو فائدہ پہنچایا، اور بڑی خدمت انجام دی۔

مرحوم ایک معروف صحافی و قلم کار ہونے کے ساتھ ایک بڑے مبصر اور دانشور تھے۔ ان کی وفات 'ملتِ اسلامیہ کے لیے بڑا خسارہ ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی حسنات کو قبول فرمائے، جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، اور ملت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

☆☆

تعلیم القرآن

تفسیر سورۂ فاتحہ

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء)

{اھدِنَــا الصِّرَاطَ المُستَقِيمَ}

(ہمیں سیدھا راستہ لے چل)۔

ظاہر ہے کہ بندگی کے ساتھ اللہ کی طرف سے مدد کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ بندہ سیدھے راستے پر چلے اور اس کو اللہ کی طرف سے استقامت حاصل ہو۔ یہاں پر "اھدنا" کا یہ مطلب نہیں کہ اے اللہ! ہمیں راستہ دکھادے بلکہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ: "اے اللہ! ہمیں انگلی پکڑ کر صحیح راستہ پر چلادے"۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیں کہ اگر آپ سے کوئی راستہ پوچھے اور آپ بتائیں کہ یوں چلے جایئے تو وہ وہاں پہنچ جائے گا لیکن دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ اس کے ساتھ جائیں اور اس کی منزل تک پہنچادیں۔

حقیقت میں "ہدایت" کا لفظ صرف اس لیے استعمال نہیں ہوتا کہ منزل دکھادی جائے بلکہ اس کا استعمال تب ہوتا ہے جب منزل تک پہنچا دیا جائے۔ بلاشبہ بندہ اس بات کا محتاج ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو صراط مستقیم عطا فرمائے یعنی اس کو منزل تک پہنچادے۔ صراط مستقیم وہ سیدھا راستہ ہے جو اللہ نے اپنے نبیوں کے ذریعہ سے اپنے بندوں کو بتایا ہے جس کی سب سے مکمل اور آخری شکل آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بتاچکے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ دنیا جس میں قدم قدم پر پھسل جانے کا خطرہ ہے اس میں ہر وقت اسی ہدایت ربانی کی ضرورت ہے۔

{صِرَاطَ الَّذِينَ أَنعَمتَ عَلَيهِمْ}

(ان لوگوں کا راستہ جن پر تونے انعام کیا۔)

اس آیت میں ایک بڑی حقیقت کی طرف اشارہ ہے، دراصل جب تک آدمی کے سامنے کوئی نمونہ نہ ہو، اس وقت تک اس کے لیے کسی راستے پر چلنا دشوار ہوتا ہے، آدمی اپنی رائے سے کوئی چیز اختیار کرلے یہ کافی نہیں ہے بلکہ یہ ضروری ہے کہ جن لوگوں نے وہ راستہ اختیار کیا ہے اور جو لوگ اس راستے پر چلے ہیں، آدمی ان کے راستے کو دیکھے، انہی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرے اور ان کی اقتدا کرے، یقینا اس وقت وہ منزل تک پہنچ سکتا ہے اور اس کے لیے پہنچنا آسان بھی ہے، لیکن اگر وہ اپنی رائے سے چلے گا تو ٹھوکر کھائے گا اور اگر وہ کسی کے پیچھے چلے گا تو اس کے لیے منزل تک پہنچنا آسان ہوگا۔

اس میں شبہ نہیں کہ شاید صرف یہی دعا کافی ہوتی: {اھدِنَــا الصِّرَاطَ المُستَقِيمَ} (ہمیں سیدھا راستہ لے چل) اور اس کے آگے وضاحت کے طور پر "صراط القرآن" یا "صراط الھدی" وغیرہ کی کوئی بھی تعبیر استعمال ہوجاتی، لیکن اس کے بعد خصوصیت کے ساتھ یہ دعا بتائی گئی کہ اے اللہ! ہمیں ان لوگوں کا راستہ عطا کر جو تیرے منعم علیہم بندے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ ہماری کامیابی تب ہوگی جب ہم ان لوگوں کے راستے پر چلیں گے جو اللہ کے خاص بندے گزرے ہیں، قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ جب اللہ نے اپنے منعم علیہم بندوں کا ذکر کیا تو یہ ارشاد فرمایا کہ:

{وَمَن يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَـٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنعَمَ اللّٰهُ عَلَيهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَـٰئِكَ رَفِيقًا} (النساء: ۶۹)۔

(اور جو لوگ اللہ اور رسول کی پیروی کریں گے تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء صدیقین وشہداء اور نیکوکار اور یہ کیا ہی خوب ساتھی ہیں۔)

اس آیت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین وہ بلند پایہ لوگ ہیں جو ہمیشہ صحیح راستے پر چلتے رہے ہیں اور دنیا جب تک قائم ہے تب تک ایسے لوگوں کی ایک تعداد رہے گی جو صدیقین، شہداء اور صالحین کے مرتبہ پر فائز ہوں گے، صحیح راستے پر چلنے والے ہوں گے، ان کو اللہ کی طرف سے انعام ملتا رہے گا اور حقیقت میں یہی وہ لوگ ہیں جن کا راستہ محفوظ ہے، اگر آدمی اپنی رائے سے چلے گا تو راستہ بھٹکے گا اور اگر آدمی ایسے لوگوں کے راستے پر چلے گا جو منعم علیہم بندے ہیں تو وہ صحیح راستے پر چلے گا اور اس کو منزل ملے گی۔

واقعہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں جو دین عطا فرمایا ہے، اس کا پورا ایک نظام ہے، اگر آدمی دین کو خالص اپنے فہم سے سمجھے گا اور خالص اپنی عقل کی بنیاد پر وہ قرآن مجید اور حدیثوں میں غور کرے گا، گرچہ ہمیں یہ حکم ہے کہ ہم غور کریں لیکن اگر ہم خالص اپنی عقل سے قرآن وحدیث کو سمجھیں گے اور وہ رہنمائی جو ہمیں ہمارے بزرگوں اور سلف سے حاصل ہوئی ہے جن میں سب سے بڑھ کر حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں،

اگر ہم اس رہنمائی کو اپنے پیش نظر نہیں رکھیں گے تو راستہ بھٹک جائیں گے اور غلط راستے پر پڑ جائیں گے۔ ہمارے سلف کا فہم حقیقت میں بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے، وہی ہمارے لیے اصل ہے جو ہمیں کامیابی کی منزل سے ہم کنار کرتا ہے، اگر ہم اپنی رائے سے دین سمجھیں گے تو خطرہ ہے کہ کہیں بھٹک نہ جائیں، اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے {اهدِنَــا الصِّرَاطَ المُستَقِيمَ} (ہمیں سیدھا راستہ لے چل) کے ساتھ {صِرَاطَ الَّذِينَ أَنعَمتَ عَلَيهِمۡ} (ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا) بھی فرمادیا تاکہ آدمی ہمیشہ اقتدا کا راستہ اختیار کرے۔

اگر دیکھا جائے تو یہی چیز حقیقت میں ''تقلید'' ہے اور وہ سلسلہ ہے جس کی طرف حدیث میں بھی اشارہ موجود ہے کہ:

''یحمل هذا العلم من کل خلف عدوله ینفون عنه تحریف الغالین وانتحال المبطلین وتأویل الجاهلین''۔

(کنز العمال: ۲۸۹۱۸)

(ہر نسل میں اس علم کے حامل ووارث ایسے عادل ومتقی لوگ ہوں گے جو اس دین سے غلو پسند لوگوں کی تحریف، اہل باطل کے غلط انتساب ودعوے اور جاہلوں کی دور از کار تاویلات کو دور کرتے رہیں گے۔)

گویا سینہ بہ سینہ پورا ایک نظام چلا آرہا ہے اور جس طرح قرآن مجید کے یہ حروف منتقل ہو رہے ہیں، ٹھیک اسی طرح ان کا فہم بھی منتقل ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بھی اس بات کی وضاحت فرمائی کہ جس طرح قرآن مجید کے حروف کی حفاظت ہمارے ذمہ ہے، اسی طرح اس کے معانی ومفاہیم کی وضاحت بھی ہمارے ذمہ ہے، ارشاد الٰہی ہے:

{لَا تُحَرِّكۡ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعۡجَلَ بِهِ★إِنَّ عَلَيۡنَا جَمۡعَهُ وَقُرۡآنَهُ★فَإِذَا قَرَأۡنَاهُ فَاتَّبِعۡ قُرۡآنَهُ ثُمَّ إِنَّ عَلَيۡنَا بَيَانَهُ} (القیامة: ۱۹-۱۶)

(آپ اس (قرآن کو پڑھنے) میں جلدی جلدی اپنی زبان کو حرکت نہ دیں، اس کو محفوظ کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمہ ہے، پھر جب ہم (جبرئیل کی زبانی) اس کو پڑھیں تو آپ اس کے پڑھنے کے ساتھ ساتھ رہیں، پھر اس کی وضاحت بھی ہمارے ذمہ ہے۔)

آپ ﷺ قرآن مجید تیزی سے پڑھتے تھے تو اللہ نے یہ آیت اتاری کہ اس کا جمع کرنا اور اس کا پڑھانا ہمارے ذمہ ہے اور ہمارے ہی ذمہ اس کا بیان اور وضاحت بھی ہے، اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے قرآن مجید کا وہ بیان جو نبی اکرم ﷺ کے قلب اطہر پر اتارا گیا، پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کو سمجھایا گیا اور انھوں نے سمجھ کر ساری دنیا کے سامنے پیش کیا اور امت کے لیے اس کی وضاحت کی، پھر حضرات تابعین اور سلف متقدمین نے اس کے مطابق دین کی تشریح کی، حقیقت میں یہی اصل دین ہے اور یہی ''صراط مستقیم'' ہے اور اسی کی ہمیں دعا سکھائی گئی ہے اور اس دعا میں یہ وضاحت ہے کہ ہم اس وقت تک ہدایت حاصل نہیں کر سکتے جب تک اللہ کے ان خاص بندوں کے راستے پر نہ چلیں اور ہمیں ان کا راستہ نہ ملے جو اس کے منعم علیہم بندے ہیں۔

{غَيۡرِ المَغضُوبِ عَلَيۡهِمۡ وَلاَ الضَّالِّينَ}۔

(نہ کہ ان لوگوں کا جن پر غضب نازل ہوا اور نہ راستہ بھٹک جانے والوں کا۔)

اس آیت کے ذریعہ بھی یہ بتادیا گیا کہ اللہ کے خاص بندوں نے جو راستہ بتایا وہی اصل ہے، تاہم جو لوگ غضب الٰہی کے مستحق ٹھہرے اور راستہ بھٹک گئے، وہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر آدمی ان کے راستے پر چلے گا تو وہ بھٹکے گا اور دوسروں کو بھی بھٹکائے گا۔ ''غضب الٰہی کے مستحق'' اور ''راستہ بھٹکے ہوئے لوگوں'' سے مراد بظاہر یہود ونصاریٰ ہیں، قرآن کی اصطلاح میں یہود ''مغضوب علیہم'' اور نصاریٰ ''ضالین'' ہیں۔ ان کے علاوہ جو بھی آدمی اپنی بے ادبی اور گستاخیوں کے سبب سیدھے راستہ سے بھٹک جائے تو ظاہر ہے کہ وہ بھی اسی زمرہ میں شامل ہوگا اور اس کے ساتھ اللہ کی مدد شامل حال نہیں ہوسکتی۔

اگر دیکھا جائے تو ایسی کون سی گستاخی ہے جو یہودیوں نے نہیں کی، انھوں نے انبیاء کو قتل کیا اور زمین میں آخری درجہ کا فساد مچایا۔ اسی طرح نصاریٰ بھی گمراہی کا اس طرح شکار ہوئے کہ گمراہی کی کوئی شکل باقی نہ رہی، یہاں تک کہ ان کی ایک بڑی گمراہی یہ تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو اللہ کے بندے اور پیغمبر تھے ان کو انھوں نے خدا کا بیٹا بنالیا۔

ہمیں یہ دعا سکھائی گئی کہ ایسے لوگ جو غلط راستے پر پڑنے والے ہیں، وہ مغضوب علیہم (یہود) ہوں یا ضالین (نصاریٰ) ہوں، یا جو لوگ بھی ان کے راستے پر چلنے والے ہوں اور غلط کام کرنے والے ہوں اور راستہ بھٹک جانے والے ہوں، ہم دعا کرتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان سے بچا کر اپنی پناہ میں رکھے۔ دنیا میں آدمی کبھی ایسے لوگوں سے متاثر نہ ہو، چاہے دنیا میں ان کا کتنا ہی دور دورہ ہو، وہ بڑے کروفر والے ہوں، سارے خزانے ان کے پاس ہوں اور بڑی حکومتیں ان کے ساتھ ہوں، آدمی یہ دھوکہ نہ کھا جائے کہ لگتا ہے یہی لوگ صحیح راستے پر ---

(باقی صفحہ نمبر ۱۵/ پر)

تعلیم الحدیث

اللہ تعالیٰ کی شان

عبدالرشید راجستھانی ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

عن أبي موسى الأشعري رضي الله عنه قال: قامَ فِينا رَسولُ اللهِ ﷺ بخَمْسِ كَلِماتٍ، فقالَ: إنَّ اللهَ عزَّ وجلَّ لا يَنامُ، ولا يَنْبَغِي له أنْ يَنامَ، يَخْفِضُ القِسْطَ ويَرْفَعُهُ، يُرْفَعُ إلَيْهِ عَمَلُ اللَّيْلِ قَبْلَ عَمَلِ النَّهارِ، وعَمَلُ النَّهارِ قَبْلَ عَمَلِ اللَّيْلِ، حِجابُهُ النُّورُ، وفي رِوايَةِ أَبِي بَكْرٍ: النّارُ، لو كَشَفَهُ لَأَحْرَقَتْ سُبُحاتُ وجْهِهِ ما انْتَهى إلَيْهِ بَصَرُهُ مِن خَلْقِهِ (صحیح مسلم: ۱۷۹)۔

ترجمہ: حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان کھڑے ہوئے اور پانچ باتیں ارشاد فرمائیں، فرمایا: ''بے شک اللہ عزّوجل نہ سوتا ہے اور نہ اس کے شایانِ شان ہے کہ وہ سوئے۔ وہ میزانِ عدل کو جھکاتا اور اٹھاتا ہے۔ رات کے اعمال دن کے اعمال سے پہلے اس کی بارگاہ میں پیش کیے جاتے ہیں، اور دن کے اعمال رات کے اعمال سے پہلے۔ اس کا حجاب نور ہے، اگر وہ اسے ہٹا دے تو اس کے چہرۂ اقدس کی تجلیات اس کی نگاہ جہاں تک پہنچے، اس کی تمام مخلوق کو جلا ڈالیں۔''

تشریح: یہ حدیث اللہ تعالیٰ کی عظمت، کبریائی اور شانِ الوہیت کو نہایت واضح اور مضبوط انداز میں بیان کرتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے سب سے پہلے یہ حقیقت بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نہ سوتا ہے اور نہ اس کے شایانِ شان ہے کہ وہ سوئے۔ نیند اور اونگھ مخلوق کی صفات ہیں، جو کمزوری اور احتیاج کی علامت ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ الحی القیوم ہے، جو خود قائم ہے اور ساری کائنات کو قائم رکھنے والا ہے۔ اس کی نگرانی میں کسی لمحے کا بھی وقفہ نہیں آتا، نہ اس کے علم میں کمی آتی ہے اور نہ اس کی تدبیر میں۔

اسی حقیقت کو قرآنِ مجید میں آیت الکرسی میں یوں بیان کیا گیا ہے: ﴿لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ﴾۔ اس ایک جملے میں اللہ تعالیٰ کی کامل تنزیہ، اس کی بے نیازی اور اس کی دائمی نگہبانی سب جمع ہوگئی ہے۔

پھر فرمایا کہ وہ میزانِ عدل کو جھکاتا اور اٹھاتا ہے۔ یعنی عزت و ذلت، وسعت و تنگی، صحت و مرض اور خوشی و غم سب اسی کے فیصلے کے تابع ہیں۔ وہی مالکُ الملک ہے، جسے چاہے عطا کرے اور جس سے چاہے واپس لے لے۔ اسباب اپنی جگہ موجود ہیں، مگر وہ بھی اسی کے حکم کے ماتحت ہیں۔ قرآنِ مجید میں فرمایا گیا: ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ہر دن ایک نئی شان میں ہوتا ہے۔ کسی بیمار کو شفا عطا فرماتا ہے، کسی تندرست کو آزمائش میں مبتلا کر دیتا ہے؛ کسی کو قوت دیتا ہے اور کسی کی قوت سلب کر لیتا ہے؛ کسی کو عزت عطا کرتا ہے اور کسی کو ذلت میں ڈال دیتا ہے؛ کسی کو بلندی پر پہنچاتا ہے اور کسی کو پستی میں گرا دیتا ہے؛ گرے ہوئے کو سہارا دے کر اٹھا لیتا ہے اور بلند نظر آنے والے کو نیچا دکھا دیتا ہے۔ یہ سب تغیرات اس کے عدل، حکمت اور فیصلے کے مطابق ہوتے ہیں، نہ کہ کسی اتفاق یا بے ترتیبی کے تحت۔

اس کے بعد حدیث میں بتایا گیا کہ رات کے اعمال دن کے اعمال سے پہلے اور دن کے اعمال رات کے اعمال سے پہلے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیے جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندے کا کوئی عمل بے حساب نہیں، نہ کوئی حرکت نظر انداز ہوتی ہے۔ قرآنِ مجید میں فرمایا گیا: ﴿إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ﴾۔

اس حقیقت کا شعور بندے کے دل میں نگرانیِ الٰہی کا احساس پیدا کرتا ہے، جس سے وہ اپنے ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے، اور نیکی میں رغبت اور گناہ سے بچنے کا داعیہ اس کے اندر مضبوط ہو جاتا ہے۔

پھر حدیث میں حجابِ الٰہی کا ذکر آیا کہ اس کا حجاب نور ہے۔ دنیا میں انسانی آنکھیں اس نور کی تاب نہیں رکھتیں، اس لیے یہ حجاب بندوں کے لیے رحمت ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی دیدار کی تمنا کی، مگر دنیا میں اس کی اجازت نہ ملی، کیونکہ یہ دنیا اس تجلی کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ البتہ آخرت میں اہلِ ایمان کو اللہ تعالیٰ اپنے دیدار سے نوازے گا، اور یہی مومن کے لیے سب سے بڑی نعمت اور ایمان کی معراج ہوگی۔

فائدہ: یہ حدیث بندے کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت، اس کی کامل قدرت اور ہمہ وقت نگرانی کا گہرا احساس پیدا کرتی ہے۔ اس سے یہ یقین پختہ ہوتا ہے کہ کائنات کا کوئی لمحہ، کوئی حالت اور کوئی عمل اللہ کے علم اور اس کے فیصلے سے باہر نہیں۔ جب بندہ جان لیتا ہے کہ اس کے اعمال دن رات اللہ کی بارگاہ میں پیش ہوتے ہیں، تو اس کے دل میں جواب دہی، احتساب اور ذمہ داری کا شعور بیدار ہوتا ہے، جو اسے گناہ سے روکتا اور نیکی کی طرف مائل کرتا ہے۔

☆☆☆

تصویرِ وطن

ہندوستان کا سیکولر و جمہوری چہرہ

انیس احمد ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

یہ بات زبان زدخاص وعام ہے کہ ہندوستان ایک جمہوری اور سیکولر ملک ہے، یہاں کی تہذیب زمانہ قدیم سے ایک گنگا جمنی تہذیب ہے، گنگا اور جمنا کے سنگم کی طرح یہاں مختلف قوم و مذہب اور گونا گوں رنگ ونسل کے لوگ باہم شیر وشکر رہتے آئے ہیں، بہت ساری ثقافتوں نے ایک ثقافت کے رنگ میں ڈھل کر ہندوستانی تہذیب وتمدن کا نام حاصل کیا ہے۔ اسی طرح کثرت میں وحدت Unity in diversity یہاں کا امتیاز رہا ہے یہ ایک Pluralistic Society رہی ہے جس کا مطلب ہی ہوتا ہے تکثیری معاشرہ یعنی ایک ایسا معاشرہ جس میں بہت ساری قومیں، تہذیبیں اور ثقافتیں ایک ساتھ مل کر ایک معاشرہ کو وجود بخشتی ہیں اور ایک دوسرے کے تئیں رواداری کے جذبات رکھے جاتے ہیں۔

ظاہر ہے اس طرح کے معاشرہ کا سب سے بڑا امتیاز کئی قوموں کا نیز تہذیبوں کا سنگم ہونا ہے، اگر اسی صفت میں کمی آجائے، داغ یا بٹہ لگ جائے تو اصل ہندوستانی تہذیب ناپید ہوتی چلی جائے گی، تہذیب کی انھیں خصوصیات کو قائم رکھنے کے لئے آئین ہند میں ان کو قانونی شکل دی گئی اور اسے بنیادی حقوق اور شہریوں کے واجبات وفرائض کا نام دیا گیا ہے، اور اسی طرح دوسرے حقوق کی بھی ضمانت دی گئی۔

بنیادی حقوق کو تمام شہریوں تک پہنچانا یہ حکومت کی ذمہ داریوں میں شامل ہے جبکہ شہریوں کے فرائض وہ ہیں جنھیں شہری خود انجام دے کر ملک کی تعمیر وترقی اور خوشحالی میں حصہ لیں، نیز فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دیں، اگر اس میں کمی واقع ہوتی ہے تو حکومت کو اس پر ایکشن لینا ہوتا ہے۔

ہندوستان کے تناظر میں جہاں ڈیموکریسی، سیکولرزم، اور پلیولرزم کی بنیادوں کو روز اول سے ملحوظ ہی نہیں رکھا گیا ہے بلکہ اس پر زور بھی دیا گیا ہے، ایسے تکثیری معاشرہ میں اس کی اہمیت دوگنی ہوجاتی ہے، ہندوستان کا حسن اسی وحدت میں قائم رہا ہے اور اس کی قوت کا راز بھی۔

گرچہ ملک میں فسطائی طاقتیں آزادی سے کافی پہلے سے یہاں کی معاشرتی ہم آہنگی نیز پرامن بقائے باہم کے ساتھ باہم دست وگریباں رہی ہیں اور ملک کو ایک مخصوص نظریہ کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کرتی رہی ہیں، امن کے نام پر بدامنی، اصلاح کے نام پر فساد، نیز ذات پات اور نسلی امتیازات کے فروغ کے نام پر فسطائیت کو بڑھاوا دیتی آئی ہیں، لاکھوں لوگوں کی جان اس نظریہ کی بھینٹ چڑھ گئی، یہاں تک کہ راشٹریہ پتا باپو کی جان بھی اسی سلسلہ میں چلی گئی، مگر ایسی سوچ والوں کی تعداد کم تھی مگر بیسویں صدی کے نصف آخر خصوصا اخیر کے دودہوں سے ان کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا ہے اور نفرت کی یہ آندھی اب شدید تر ہوتی چلی جارہی ہے اسی لئے الفت ویگانگی نیز محبت ورواداری کے چراغ بجھتے جارہے ہیں۔

زندگی، سیاست، میدان عمل، رہن سہن، معاشرت، تعلیم واقتصاد ہر میدان میں اس تعصب کا اثر دکھنے لگا ہے، فیناٹزم (عصبیت) کا زہر معاشرہ میں پھیلتا جارہا ہے، اس طرح بنیادی حقوق جن کی گارنٹی آئین ہند میں دی گئی ہے تعصب کی نذر ہوجانے کا خوف لاحق ہے۔

بنیادی حقوق میں اظہار رائے کی آزادی بھی شامل ہے، ہندوستان کا آئین شہریوں کے لئے اس کی گارنٹی دیتا ہے، اس کو بالفاظ دیگر کسی کی رائے سے اختلاف رکھنا بھی کہہ سکتے ہیں، کسی سلسلہ میں میری رائے دوسروں سے الگ ہوسکتی ہے لیکن دوسرے کی رائے کا احترام ضروری ہے، اس کا مذاق نہیں اڑایا جاسکتا ہے، اسی طرح مذہبی رہنما اور مذہبی مقدس شخصیات کا بھی مذاق اڑانا، ان کا استہزاء کرنا، ان پر کیچڑ اچھالنا سب غلط بلکہ قابل سزا جرم ہے اور دستور میں دی گئی اظہار رائے کی آزادی کی پامالی بھی۔

ہندوستان کی نفرتی تقریر کے متعلق جو قوانین ہیں ان میں تبدیلی کی ضرورت ہے، اسی طرح بلاسفیمی (توہین مقدسات) کے خلاف قوانین اور نفرتی تقریر پر قانونی بندشیں ایسی ہیں کہ ان میں تبدیلی کی جائے، الفاظ میں جو لچک ہے اس کو دور کیا جائے۔

تعزیرات ہند کی دفعہ دوقسم کے نفرتی اظہار بیان کو روکتی ہے پہلی دفعہ ۲۹۵ اے بلاسفیمی کے

خلاف قانون ہے جو مذہب یا مذہبی رہنماؤں کی اہانت اور تذلیل سے متعلق ہے یعنی ایسا اہانت آمیز نیز جارحانہ اظہار بیان جس سے دوسروں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگے یا تکلیف پہنچے قابل سزا جرم ہے۔ اس قانون کو ۱۰۰ سال پہلے تعزیرات ہند میں شامل کیا گیا جب شمالی ہند میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھتی جا رہی تھی، اس وقت سے اس پر عمل جاری رہا، آزادی کے پہلے اور بعد کے زمانے میں اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر طرح کے مذہبی نقد و تنقید کو، مذہب پر ہر قسم کے طنز واستہزاء اور مذاق کو قابل جرم سزا گردانا گیا، اور اس سے نظم وضبط قائم ہوا، کشیدگی ختم ہوئی اور امن و آشتی کی راہ ہموار ہوئی۔

دوسرے کا تعلق ہیٹ اسپیچ (نفرت بھری تقریر) یعنی ایسی تقریر یا بیان سے ہے جو کسی مخصوص طبقہ میں بھید بھاؤ یا منافرت پیدا کرے، ہم آہنگی کو ختم کرے اور حقوق سے محرومی کی وکالت کرے لیکن اس کا دائرہ بھی اس قدر وسیع ہے کہ اس کا انطباق بھی بمشکل کسی پر ہوتا ہے، اسی لئے بہت سے نفرتی بیان دینے والے آزاد ہیں ان پر کسی طرح کی کوئی بندش نہیں۔

قانون کی نگاہ میں سارے شہری برابر ہوتے ہیں، سب کو برابر کے حقوق حاصل ہوتے ہیں، رنگ، نسل، قوم، مذہب، زبان، علاقہ کسی بھی بنیاد پر کسی کو فوقیت نہیں دی جاسکتی ہے، اقلیت اور اکثریت کی بنیاد پر قانون کو موڑا نہیں جاسکتا ہے، اگرچہ قانون میں روزن ہیں لیکن اس کا سہارا محض انصاف کی فراہمی کے لئے کیا جاسکتا ہے، کسی مخصوص گروپ یا کمیونٹی کو فائدہ پہنچانے کے لئے نہیں، ہمارا دستور ان سب حقوق کی گارنٹی دیتا ہے۔

اس کے بعد اقلیتوں کے حقوق کی پاسداری اور لحاظ کا مسئلہ ہے، اس کے لئے بھی قانون وضع کئے گئے ہیں، اقلیتیں ہر ملک میں ہوتی ہیں، اکثریت کو اپنی کثرت اور عصبیت پر ناز و گھمنڈ ہوتا ہے، وہ ذرا سا اکسانے پر ظلم وتعدی کے لئے تیار ہو جاتا ہے، ان کو ظلم وتعدی سے روکنا حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

یقیناً نفرت کی سیاست ملک کے لئے سم قاتل ہے، اس سے ملک کی عزت کو بٹہ لگ رہا ہے اور یہ ملک کے جمہوری ڈھانچہ کے خلاف ہے۔

آپ حالات حاضرہ پر ایک نگاہ ڈالیں، آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ ملک کی باگ ڈور اب ایسے ہاتھوں میں آچکی ہے جو نفرت کی سیاست کو ہمہ وقت گرم رکھ کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے ہیں، گلی محلہ کی سطح کے نیتا ایسی منحوس بولی بولتے ہیں، ایک کمیونٹی کو اپنی بد دماغیوں کا ٹارگٹ بناتے ہیں ان کا بال بیکا نہیں ہوتا الٹے اور ان کی ترقی ہوتی ہے، ان کو زنداں کے شب و روز کا مزہ چکھانے کے بجائے ان کا اعزاز بڑھ جاتا ہے اور بڑے سیاست داں اس پر کچھ ناک بھوں چڑھانا تو دور کی بات اس کی ناپسندیدگی کا اظہار بھی نہیں کرتے، خواہ وہ ماب لنچنگ ہو یا اقلیتوں کی ایذا رسانی، مسلمانوں کے قتل عام کی دھمکی ہو یا ہفوات زبانی۔

جب کپڑوں سے پہچاننے کی بات ہونے لگی تو جمہوریت پر ایک داغ لگا، بغیر قانونی کاروائی کے بلڈوزر چلا تو جمہوریت شرمسار ہوئی، امن پسند لوگوں کو احتجاج سے محروم کیا گیا تو ایک جمہوری حق چھین لیا گیا۔ بلوائیوں کو کپڑے، ذات پات، مذہب اور نام سے پہچاننا عدلیہ کا مذاق ہے، پراپرٹی کا حق، کورٹ سے رجوع کرنے کا حق یعنی مجرم پر کاروائی سے پہلے اسے سنا جائے جسے قانونی چارہ جوئی کا حق کہتے ہیں، ہاں ٹھیک ہے اگر آپ ڈیمولیشن پر یکلخت پابندی نہ لگائیں مگر مجرم اور غاصب کو سنیں ضرور اور میونسپل بورڈ بھی اپنی کاروائی غیر جانبداری سے نیز قانونی طور پر انجام دے۔

یہ عجیب بات ہے ملک جس کی وجہ سے بدنام ہوتا ہے اس کی جمہوری شہرت و نیک نامی پر بدنما داغ لگتا ہے اس پر کوئی کاروائی نہیں ہوتی مگر جو لوگ اس کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں ان کے خلاف فورا ایف آئی آر درج ہوجاتی ہے اور کاروائی بھی ہوتی ہے، یہی چیز ہے جس سے نفرت کی ذہنیت کو بڑھاوا ملتا ہے، یعنی مسلم دشمنی کو الیکشن کے ایک ایجنڈہ کے طور پر دیکھا جا رہا ہے، گجرات، اترپردیش، مدھیہ پردیش میں یہ ایجنڈہ اپنایا گیا اور اب اسی ایجنڈہ کو پورے ملک میں اپنایا جا رہا ہے۔

پورے ملک کو ہر وقت الیکشن موڈ میں رکھنے کے بجائے اس کی ترقی اور ڈیولپمنٹ کی راہیں ہموار کرنی ہوں گی، توڑنے کے بجائے جوڑنے کی اور پارہ پارہ کرنے کے بجائے اس کی سالمیت کو عزیز رکھنا ہوگا، اتحاد واتفاق، دوستی و یگانگت، امن وامان نیز بھائی چارہ کو بڑھاوا دینا ہوگا، اس طرح سے ملک میں شخصی آزادی بحال ہوگی، امن وامان قائم ہوگا اور ملک تیزی سے خوشحالی اور ترقی کے راستے پر گامزن ہوگا۔

☆☆☆

علم و عمل

نصابی تعلیم اور ہم نصابی سرگرمیاں

محمد مستقیم ندوی رائے بریلوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

یہ حقیقت روزِ روشن کی مانند عیاں ہے کہ ربِّ ذوالجلال نے انسان کو جو بیش بہا نعمتیں عطا فرمائی ہیں، ان میں 'عقل سلیم' اور 'جسم سالم' کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہی دو سرمایۂ حیات ہیں جن کی موجودگی کے بغیر قارون کے خزانے بھی گویا بے مصرف اور مردہ پڑے رہتے ہیں۔

قرآنِ حکیم انسان کو علم کی روشنی اور قوت کی تیاری، دونوں کی جانب یکساں توجہ دلاتا ہے۔

ایک جانب ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (کہہ دیجیے! کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں؟) (الزمر: ۹)

اور دوسری جانب قوت و استعداد کی تیاری کا حکم ہے:

﴿وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ﴾ (اور ان کے مقابلے کے لیے جہاں تک تم سے ہو سکے قوت تیار رکھو) (الانفال: ۶۰)۔

یہ دونوں آیاتِ مبارکہ اس عظیم حقیقت کی نہایت فصیح ترجمانی کرتی ہیں کہ اسلام محض روحانی یا فکری تربیت پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ انسان کی فکری پختگی، اخلاقی بلندی اور جسمانی قوت کو ایک متوازن و جامع نظام کے تحت مطلوب و مرغوب قرار دیتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے اسی توازنِ کمال کو نہایت بلیغ و جامع انداز میں بیان فرمایا:

"الْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ وَأَحَبُّ إِلَى اللهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ۔" (طاقتور مؤمن، کمزور مؤمن سے بہتر اور اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہے۔) (مسلم)

یہاں قوت سے مراد محض جسمانی طاقت نہیں، بلکہ فکری گہرائی، عملی مہارت، اخلاقی پائیداری اور کردار کی استواری بھی شامل ہے۔

اسی طرح علم کی عظمت بیان کرتے ہوئے فرمایا: الْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ یعنی علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ اس سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ علم و تربیت درحقیقت نبوی مشن کا مسلسل و زندہ تسلسل ہے۔

اس پس منظر میں یہ بات بخوبی سمجھی جاسکتی ہے تعلیم کا اصل مقصد محض امتحانات پاس کرنا یا سند فراغت حاصل کرنا نہیں، بلکہ ایسے انسانِ کامل کی تشکیل ہے جو علم، عمل اور اخلاق کے تینوں میدانوں میں امت کی رہبری و ہدایت کا اہل ہو سکے۔

اسی جامع تصورِ تعلیم کا ایک زندہ و عملی مظہر نصابی تعلیم (Curriculum) کے ساتھ "ہم نصابی سرگرمیوں" (Co-curricular Activities) کا منظم اہتمام ہے۔

جدید تعلیمی تحقیقات خواہ وہ یونیسکو کی رپورٹس ہوں یا ہارورڈ، اسٹینفورڈ اور دیگر عالمی جامعات کی سائنسی تحقیق، اس نتیجے پر متفق ہیں کہ ہم نصابی سرگرمیاں طلبہ کی ہمہ جہت شخصیت سازی میں بنیادی اور فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہیں۔

یہ سرگرمیاں طالب علم کو کتابوں کے محدود دائرے سے نکال کر حقیقتِ زندگی کے وسیع و کشادہ میدان میں داخل کرتی ہیں، جہاں وہ سیکھے ہوئے اسباق کو عملی امتحان میں پرکھنا اور آزمانا سیکھتا ہے۔

دعوتی و تربیتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہم نصابی سرگرمیاں محض تفریح یا وقتی مشغلہ نہیں، بلکہ ایک مؤثر ذریعۂ تربیت ہیں۔ خطابت، مضمون نویسی، مکالمہ اور مباحثہ جیسی ادبی سرگرمیاں طلبہ میں فصاحت و بلاغت، حق گوئی، دعوتی اسلوب اور فکری جرأت پیدا کرتی ہیں۔

کھیل، جسمانی مشقیں اور ورزشیں نہ صرف جسم کو توانا بناتی ہیں بلکہ نظم و ضبط، صبر و برداشت، ٹیم ورک اور اجتماعی شعور کو بھی پروان چڑھاتی ہیں۔

سماجی سرگرمیاں جیسے صفائی مہم، خدمتِ خلق، غریب پروری اور فلاحی کام طلبہ کے اندر ایثار، ذمہ داری، معاشرتی اصلاح اور انسانی ہمدردی کا جذبہ بیدار کرتی ہیں، جو دعوتِ دین کا بنیادی اور ناگزیر تقاضا ہے۔ اسی طرح تخلیقی، تحقیقی اور سائنسی سرگرمیاں عقل کو جمود و تعطل سے نکال کر غور و فکر، اور بحث و تحقیق کی جانب لے جاتی ہیں، اور یہی وہ روشن راستہ ہے جس سے ایک باشعور، بیدار اور داعی ذہن کی تشکیل ممکن ہوتی ہے۔

علمی و دعوتی اسفار اور اہلِ علم و عمل سے ملاقاتیں بھی نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ علمی دورے طلبہ کو کتابی علم کے حدود سے نکال کر عملی دنیا سے روشناس کراتے ہیں اور انہیں یہ موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ علم کو اس کے زندہ مظاہر کے ساتھ دیکھ سکیں۔ تعلیمی اداروں، جامعات، کتب خانوں، تحقیقی مراکز اور سماجی اداروں کے دورے طلبہ کے ذہن میں سوال پیدا کرتے ہیں، مشاہدے کی قوت کو بیدار کرتے ہیں اور تحقیق کا ذوق پروان چڑھاتے ہیں۔

اسی طرح اہلِ علم، مفکرین، سماجی رہنماؤں اور دعوت و خدمت کے میدان میں سرگرم شخصیات سے ملاقاتیں طلبہ کے لیے زندہ اسوہ بن جاتی ہیں،

جن سے انہیں مقصدِ حیات، عملی جدوجہد اور کردار سازی کا شعور حاصل ہوتا ہے۔ اس قسم کی سرگرمیاں طلبہ کے اندر اعتماد، وسعتِ نظر اور دعوتی ذمہ داری کا احساس پیدا کرتی ہیں اور انہیں مستقبل میں علم و عمل کے میدان میں فعال اور بااثر کردار ادا کرنے کے لیے تیار کرتی ہیں۔

تاہم اسلام اعتدال و توازن کا دین ہے۔ تعلیم کے میدان میں بھی میزان کی پابندی از حد ضروری ہے۔ اگر "ہم نصابی سرگرمیاں" حد سے تجاوز کر جائیں تو نصابی تعلیم متاثر ہو سکتی ہے اور اگر انہیں کلیۃً نظر انداز کر دیا جائے تو شخصیت یک رخی اور نامتوازن رہ جاتی ہے۔ لہٰذا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ان سرگرمیوں کو منظم منصوبہ بندی، واضح اہداف اور وقت کی پابندی کے تحت ترتیب دیا جائے تاکہ وہ تعلیم کے اعلیٰ مقاصد کی معاون بنیں، نہ کہ رکاوٹ۔

سال کے آغاز میں، یا کم از کم ماہانہ بنیاد پر منظم پلاننگ طلبہ کو وقت کے درست استعمال، ترجیحات کے تعین اور زندگی کی متوازن منصوبہ بندی کا عملی سبق دیتی ہے۔

آخر میں یہ امر بطور خاص قابلِ غور ہے کہ آج کا دور محض اسناد و ڈگریوں کا نہیں، بلکہ صلاحیتوں، قابلیتوں اور کردار کا دور ہے۔ امتِ مسلمہ کو ایسے جوان درکار ہیں جو علم میں پختہ، جسم میں توانا، فکر میں بیدار اور کردار میں مضبوط ہوں۔

نصابی تعلیم ذہن کو نورانی کرتی ہے اور ہم نصابی سرگرمیاں اس نور کو عملی زندگی کے ہر شعبے میں منعکس کرتی ہیں۔ جب یہ دونوں عناصر دعوتی شعور اور نبوی اسوہ کے ساتھ مل کر جمع ہو جائیں تو وہ نئی نسل پروان چڑھتی ہے جو نہ صرف اپنے لیے بلکہ پوری انسانیت کے لیے خیر، ہدایت اور رحمت کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

☆☆☆

سیرت طیبہ کے سلسلۃ الذہب کا نیا شاہکار

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم رحمۃ للعالمین

تالیف: حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مدظلہ العالی

عہد حاضر میں محدثین ہند کی عظیم الشان روایات کے وارث و امین حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی دامت برکاتہم کی تصنیفی و تالیفی زندگی کی حاصل، سرور دو عالم ﷺ کی سیرت پاک سے روشنی اور رہنمائی کے لیے موجودہ عہد کے تقاضوں اور جدید انسانی معاشرہ و مزاج کی مناسبت سے حضور پاک ﷺ کی رحمۃ للعالمینی کی دلنشیں، دلنواز اور دلکش تشریح علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی سیرت النبی ﷺ کے سو سال بعد سیرت نگاری میں مجددانہ کارنامہ تین ضخیم جلدوں میں خیر و برکت کی حامل یہ سیرت مصطفی عرب و عجم کے اہل نظر کی داد و تحسین کے مطابق:

۱ حضور ﷺ کی ذات اور سیرت پر لکھنے کا مطلب ہے کہ حرمین شریفین پر بھی قلم اٹھایا جائے، یہ وہ نکتہ ہے جسے ڈاکٹر تقی الدین ندوی نے اس کتاب میں خاص طور پر ملحوظ رکھا۔
محمد رسول اللہ ﷺ رحمۃ للعالمین (ڈاکٹر عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی - سابق جنرل سکریٹری رابطہ عالم اسلامی، مکہ مکرمہ)

۲ یہ سیرت پاک کے موضوع پر گراں قدر تصنیف ہے، میں اس کو شیخ ندوی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خصوصی مہربانی اور فضل ربانی سمجھتا ہوں۔ (ڈاکٹر سعود بن ابراہیم الشریم - امام و خطیب مسجد حرام مکۃ المکرمہ)

۳ یہ جامع انسائیکلوپیڈیا ہے، مشرق و مغرب میں پوری امت اسلامیہ کے لیے گراں قدر تحفہ ہے۔
(ڈاکٹر ابولبابہ طاہر صالح حسین)

۴ یہ عظیم الشان کتاب جامعیت اور دلکشی میں بے مثال اور عظیم شاہکار ہے اور ایسی کتاب ہے جس میں افراط و تفریط دونوں انتہاؤں سے بچ کر اعتدال کا راستہ اختیار کیا گیا ہے، زبان عصر حاضر کے فہم کے مطابق ہے۔
(ڈاکٹر موفق بن عبداللہ - استاذ حدیث جامعہ ام القریٰ)

۵ بنیادی خوبی یہ ہے کہ سیرت نبوی پر لکھنے کے لیے جن باتوں کا علم ضروری ہے اس میں صاحب کتاب کمال مہارت کے حامل ہیں۔ اس کے مطالعہ سے ایمان و عقیدہ کو مضبوطی حاصل ہوتی ہے۔ (مولانا سید محمد رابع ندوی)

دیدہ زیب کتابت، بہتر مجلد خوبصورت سرورق کے ساتھ تین جلدوں کا مکمل سیٹ حاصل کرنے کے لیے جامعہ اسلامیہ مظفرپور اعظم گڑھ یوپی اور دیوبند اور ندوہ کے مشہور مکتبوں سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

پتہ **جامعہ بُکڈپو** جامعہ اسلامیہ مظفرپور اعظم گڑھ یوپی
موبائل نمبر: 9450876465 9532829745
قیمت: 2000 خصوصی رعایت کے ساتھ قیمت: 750

خلق حسن

اخلاقی طاقت اور عالمی قیادت

ڈاکٹر محمد وثیق ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

اخلاق، عقیدہ کا ایک اہم جز ہے؛ اس کے بغیر نہ عقیدہ اپنی پاکیزگی برقرار رکھ سکتا ہے اور نہ ایمان اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے۔ صاف، سچا اور صحیح عقیدہ لازماً اعلیٰ اخلاق کا طالب ہوتا ہے، اسی حقیقت کے پیشِ نظر رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ کرامؓ کی تربیت کا خاص اہتمام فرمایا اور انہیں 'مکارمِ اخلاق' سے آراستہ کرنے کے لیے متنوع طریقے اختیار کیے۔

آپ ﷺ ان کے سامنے قرآنِ حکیم کی آیات کی تلاوت فرماتے، وہ انہیں توجہ سے سنتے، ان میں تدبر کرتے اور پھر اپنی عملی زندگی میں قرآنی تعلیمات کا پیکر بن جاتے۔

رسول اللہ ﷺ خود کامل اسوہ، سچے معلم اور دانا مربی تھے، کیونکہ آپ ﷺ عظیم ترین اخلاق کے حامل تھے: "وإنك لعلى خلق عظيم" (سورہ قلم: ۴) [اور بے شک آپ عظیم ترین اخلاق پر فائز ہیں]۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نہایت جامع الفاظ میں فرمایا کہ رسول ﷺ کا اخلاق سراپا قرآن تھا۔

نبی کریم ﷺ نے حسنِ اخلاق کی غیر معمولی اہمیت واضح فرمائی اور بار بار اس کی ترغیب دی۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

"قیامت کے دن مومن کے اعمال کے ترازو میں حسنِ اخلاق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہ ہوگی"۔ اور فرمایا: "تم میں مجھے سب سے زیادہ محبوب اور قیامت کے دن میرے سب سے زیادہ قریب وہ لوگ ہوں گے جو اخلاق میں سب سے بہتر ہوں گے"۔ نیز فرمایا: "ایک مومن اپنے حسن سلوک اور خوش اخلاق ہونے کے باعث روزہ دار اور شب زندہ دار کے مرتبے کو پا لیتا ہے"۔ جب ایک شخص نے دریافت کیا: ایمان کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے جواب دیا: "صبر، بردباری اور اچھے اخلاق"۔

ایک عربی شاعر کہتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ: "نہ دنیا دین کے بغیر ہے، اور نہ دین اخلاقِ حسنہ کے بغیر"۔

اسلام میں اخلاق نہ کوئی ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اور نہ انسانی زندگی کے کسی محدود گوشے تک محصور ہیں؛ بلکہ وہ اسلامی فکر وعمل کی بنیاد اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر محیط ہیں۔ دراصل انسانی کردار کے تمام اخلاقی مظاہر، صحیح عقیدہ اور خالص ایمان کی سچی عملی تصویر ہوتے ہیں۔ ایمان محض دل کے کسی گوشے میں چھپا ہوا جذبہ نہیں، بلکہ وہ ظاہر ہونے والا کردار اور جیتا جاگتا عمل ہے۔ اگر عمل نظر نہ آئے یا اس کے برعکس رویہ دکھائی دے، تو بجا طور پر سوال اٹھتا ہے کہ پھر ایمان کہاں ہے اور اس کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے؟ اسی نکتے کی نشان دہی سید محمد قطب نے اپنی تصنیف "دراسات إسلامية" اور ڈاکٹر محمد علی صلابی نے اپنی کتاب "السيرة النبوية" میں کی ہے۔

قرآنِ مجید نے "سچے مومن" کی نہایت دل نشیں اور جامع تصویر مختلف سورتوں جیسے اسراء، فرقان اور مؤمنون میں کھینچی ہے۔ ان سورتوں میں ایسے بے مثال اخلاقی آداب بیان ہوئے ہیں جو فرد اور معاشرے دونوں کے لیے اعلیٰ ترین رہنمائی فراہم کرتے ہیں؛ ایسی رہنمائی جس کی ہم سری قدیم وجدید تہذیبوں کے مہذب ترین معاشرے بھی نہیں کر سکے۔ قرآن کہتا ہے: "صبغة الله ومن أحسن من الله صبغة" یہ اللہ کا رنگ ہے، اور اللہ کے رنگ سے بہتر رنگ کس کا ہوسکتا ہے۔

قرآنِ کریم بیک وقت ایمان، عبادات، شریعت، اخلاق اور نظامِ حیات کی تعلیم دیتا ہے۔ چنانچہ اخلاق کوئی محض انفرادی فضائل، سماجی آداب یا تہذیبی عادات نہیں، بلکہ دین کا لازمی حصہ اور قرآنی نظام زندگی کی بنیاد ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے اخلاق کو مرکزی حیثیت عطا فرمائی، فضائلِ اخلاق کی طرف رغبت دلائی اور اخلاقی برائیوں سے سختی کے ساتھ خبردار کیا۔

اگر عقائد اسلامی عمارت کے ستون ہیں، شریعت اس کے در و دیوار اور راستے ہیں، تو اخلاق اس عمارت کی رونق، حسن اور ربانی رنگ ہیں۔ اگر عقیدہ جڑ اور تنا ہے تو شریعت شاخیں ہیں اور اخلاق اس درخت کے میٹھے پھل اور گھنی چھاؤں ہیں۔

اسلامی نظامِ زندگی اخلاق کے بغیر نامکمل ہے، کیونکہ اخلاق ایمان کی بنیاد اور اسلامی حکومت کا مضبوط سہارا ہیں۔ آج کا سب سے بڑا بحران درحقیقت ایمان اور اخلاق کا بحران ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے بقول، افراد ہوں یا جماعتیں، معاشرے ہوں یا حکومتیں، حتیٰ کہ عالمی نظام، ہر سطح پر جو بگاڑ نظر آتا ہے، اس کی جڑ اخلاقی زوال ہے، محض حکومتوں یا پارٹیوں کی تبدیلی مسائل کا حل نہیں؛ اصل مسئلہ ذہنیت، عقیدہ اور نفس کی اصلاح کا ہے۔

اسلام ایک ایسا جامع اخلاقی نظام پیش کرتا ہے جو مسلمان کے اپنے بھائی کے ساتھ بھی اور غیر مسلم کے ساتھ بھی اس کے رویّے کو سنوارتا ہے، یہی اخلاقی نظام معاشرے کو مضبوط، مربوط، باہم دست وبازو اور دنیا کی قیادت کے لائق بناتا ہے۔

اسلامی اخلاق کا سب سے روشن نمونہ ''عبادُ الرحمن'' ہیں جن کا ذکر سورہ فرقان میں آیا ہی:

وَعِبادُ الرَّحمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُونَ عَلَی الْأَرْضِ ھَوْناً وَإِذَا خَاطَبَھُمُ الْجَاھِلُونَ قَالُوا سَلاماً، وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُونَ لِرَبِّھِمْ سُجَّداً وَقِیَاماً، وَالَّذِیْنَ یَقُولُونَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَھَنَّمَ إِنَّ عَذَابَھَا کَانَ غَرَاماً، إِنَّھَا سَاءَتْ مُسْتَقَرّاً وَمُقَاماً، وَالَّذِیْنَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ یُسْرِفُوا وَلَمْ یَقْتُرُوا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَاماً، وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُونَ مَعَ اللّٰہِ إِلٰھاً آخَرَ وَلَا یَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا یَزْنُونَ وَمَن یَفْعَلْ ذٰلِکَ یَلْقَ أَثَاماً، یُضَاعَفْ لَہُ الْعَذَابُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَیَخْلُدْ فِیْہِ مُھَاناً، إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلاً صَالِحاً فَأُوْلٰئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّئَاتِھِمْ حَسَنَاتٍ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوراً رَّحِیْماً، وَمَن تَابَ وَعَمِلَ صَالِحاً فَإِنَّہُ یَتُوبُ إِلَی اللّٰہِ مَتَاباً، وَالَّذِیْنَ لَا یَشْھَدُونَ الزُّورَ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا کِرَاماً۔ (الفرقان: ۶۳-۷۲)

[اور خدا کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے (جاہلانہ) گفتگو کرتے ہیں تو سلام کہتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کے آگے سجدہ کرکے اور (عجز وادب سے) کھڑے رہ کر راتیں بسر کرتے ہیں اور وہ جو دعا مانگتے ہیں کہ اے پروردگار دوزخ کے عذاب کو ہم سے دور رکھیو کہ اس کا عذاب بڑی تکلیف کی چیز ہے اور دوزخ ٹھہرنے اور رہنے کی بہت بُری جگہ ہے اور وہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ بیجا اُڑاتے ہیں اور نہ وہ تنگی کو کام میں لاتے ہیں بلکہ وہ اعتدال کے ساتھ ہوتا ہے، ضرورت سے زیادہ نہ کم اور وہ ہیں جو خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور جس جاندار کا مارڈالنا خدا نے حرام کیا ہے اس کو قتل نہیں کرتے مگر جائز طریقہ پر (یعنی حکم شریعت کے مطابق) اور بدکاری نہیں کرتے اور جو یہ کام کرے گا سخت گناہ میں مبتلا ہوگا۔ قیامت کے دن اس کا عذاب دوگنا کردیا جائے گا اور اسی میں ہمیشہ ذلیل ہوکر پڑا رہے گا، مگر ہاں جو توبہ کرلے اور ایمان لے آئے اور اچھے کام کرے، تو ایسوں کی برائیوں کو اللہ نیکیوں سے بدل دے گا اور وہ تو بڑی مغفرت کرنے والا نہایت رحم فرمانے والا ہے، اور جو توبہ کرتا ہے اور اچھے کام کرتا ہے تو وہ یقینا اللہ کی طرف پورا لوٹ آتا ہے اور جو جھوٹ میں شامل نہیں ہوتے اور جب لغویات کے پاس گزرتے ہیں تو شریفانہ گزرتے ہیں]۔

اگر کسی معاشرے میں یہ اخلاق پروان چڑھ جائیں تو وہی معاشرہ سب سے بہتر ہے اور اگر مسلمان۔ افراد، جماعتیں، حکمراں اور عوام سب ان اخلاق کو اپنالیں، تو وہی انسانیت کے لیے سب سے اعلیٰ اور دنیا کی قیادت کے سب سے زیادہ حق دار ہوں گے۔

اسلامی نظام اخلاقی اقدار کے بغیر مکمل نہیں ہوتا، جب کہ مغربی نظام محض قوت کے فلسفے پر قائم ہے، اخلاقی قوت سے بے نیاز۔ ایسا نظام جو اقدار اور اخلاق سے خالی ہو، قیادتِ عالم کا اہل نہیں ہوسکتا۔

آج کی دنیا جنگ، خون ریزی، ظلم، استحصال، خوف و ہراس، غنڈہ گردی اور دہشت گردی سے بھری ہوئی ہے۔ ایسے پرآشوب دور میں انسانیت کو ''عبادُ الرحمن'' جیسے ''کرداروں'' کی بڑی ضرورت ہے، جو دنیا کو بدامنی سے امن، اندھیروں سے اجالے اور تباہی سے فلاح کی طرف لے جاسکیں، یہی لوگ حقیقت میں کامیاب اور یہی دنیا کی قیادت کے سب سے زیادہ حق دار ہیں۔

☆☆☆

بقیہ: تفسیر سورۂ فاتحہ

ظاہر ہے اس طرح آدمی دھوکہ میں پڑکر غلط راستے پر چل سکتا ہے، اسی لیے قرآن مجید میں اس بات کا ذکر بھی ہے، ارشاد الٰہی ہے:

{وَإِذَا رَأَیْتَھُمْ تُعْجِبُکَ أَجْسَامُھُمْ وَإِن یَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِھِمْ کَأَنَّھُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَۃٌ} (المنافقون: ۴) (اور جب آپ ان کو دیکھیں تو ان کے قدوقامت آپ کو خوشنما معلوم ہوں اور اگر وہ بولیں تو آپ ان کی بات سننے رہ جائیں جیسے وہ لکڑیاں ہوں جن کو سہارے سے کھڑا کردیا گیا ہو۔)

دنیا میں جن لوگوں کا دوردورہ نظر آتا ہے، ان سے آدمی ہرگز دھوکہ میں نہ پڑے، قرآن مجید میں صاف ارشاد ہے:

{لاَ یَغُرَّنَّکَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ کَفَرُواْ فِیْ الْبِلاَدِ٭مَتَاعٌ قَلِیْلٌ ثُمَّ مَأْوَاھُمْ جَھَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِھَادُ} (آل عمران: ۱۹۶-۱۹۷) (جنھوں نے کفر کیا ملکوں میں ان کا دوردورہ ہرگز آپ کو دھوکہ میں نہ ڈال دے، یہ تھوڑا سا مزہ ہے پھر ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بدترین رہنے کی جگہ ہے)۔

حاصل یہ کہ ہمیں ہر نماز میں یہ دعا کرنے کی ہدایت دی گئی ہے کہ ہم اللہ کے منعم علیہم بندوں کے راستے پر چلنے کی دعا کریں اور ان لوگوں کے راستے سے براءت کا اظہار کریں جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور وہ لوگ بھی جو راستے سے بھٹک گئے۔

☆☆☆

دینِ فطرت

اسلام میں مساواتِ مرد و زن کا تصور

منور سلطان ندوی (رفیق علمی مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء)

مغرب کے حوالے سے عورتوں کی آزادی، مساوات اور انہیں خودمختار بنانے کی باتیں اتنی کثرت کی جاتی ہیں کہ بہت سے سادہ لوح اور عام ذہن کے مسلمان بھی اس بات کو عملاً قبول کر چکے ہیں کہ عورتوں کو یہ حقوق مغرب کی وجہ سے ملے ہیں، جبکہ حقیقت ہے کہ یہ دعوی تاریخی اور علمی لحاظ سے محل نظر ہے، عورتوں کو ان کا جائز حق مغرب نے نہیں اسلام نے دیا ہے، مغرب کی نشاۃ ثانیہ سے بہت پہلے اسلام نے عورت کو وہ مقام و مرتبہ عطا کیا جس کی وہ مستحق تھیں، مسلم معاشرہ اس کا بہترین عکاس اور مسلم خواتین کی دینی، علمی، تعلیمی، سماجی، معاشی اور سیاسی سرگرمیاں اس کی گواہ ہیں۔

اسلام میں عورتوں کو جو حقوق دئے گئے ہیں ان میں ایک مساوات کا حق بھی ہے، یہاں مساوات سے مراد عورت کو مردوں کے شانہ بہ شانہ کھڑا کرنا نہیں ہے، بلکہ عورت کے حقوق کو محفوظ کرنا اور انہیں ان کی فطرت کے مطابق کارگاہ عمل میں اپنا کردار ادا کرنے کے لائق بنانا ہے، اسلام میں مرد و عورت کے درمیان مساوات کی مضبوط اور مستحکم بنیادیں ہیں، جن میں سے چند اس طرح ہیں:

۱- انسانی حیثیت میں برابری

جس دور میں عورت کے سلسلہ میں یہ بحث جاری تھی کہ عورت انسان ہے بھی یا نہیں، اس دور میں عورت کو انسانی حیثیت سے مرد کے برابر ہونے کا درجہ دیا گیا، جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ انسان ہونے کی بنیاد پر جو حقوق مردوں کو حاصل ہیں ان حقوق کی حقدار عورتیں بھی ہیں، یہ ایک ایسا انقلابی تصور تھا جس نے عورت کے بارے میں غالب سماجی ذہنیت کو بدل کر رکھ دیا، اب عورت ایک مستقل ہستی ہے، وہ قابل عزت اور قابل احترام ہے، میدان عمل میں مردوں سے پیچھے نہیں، بلکہ بہت سی چیزوں میں مردوں سے آگے اور بہت آگے ہیں۔

قرآن کریم کی متعدد آیات میں یہ بات کہی گئی ہے کہ مرد و عورت دونوں ایک نفس سے پیدا کئے گئے ہیں: **یا ایها الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدة و خلق منها زوجها وبث منهما رجالا کثیرا۔** (سورہ نساء:۱)

اس آیت میں یہ اشارہ واضح طور پر موجود ہے کہ مرد و عورت دونوں کی اصل ایک ہی ہے، نہ مرد کسی خاص جوہر سے بنا ہے اور نہ عورت کسی دوسرے جوہر سے بنائی گئی ہے، بلکہ دونوں ایک ہی اصل کی دو شاخیں ہیں، اور وہ اصل و بنیاد مٹی ہے، لہٰذا جب دونوں ایک ہی اصل کی پیداوار ہیں تو دونوں میں امتیاز کیسا؟

اسی طرح یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ امتیاز اور فضیلت کی بنیاد جنس نہیں ہے، بلکہ تقوی ہے: **ان أکرمکم عند الله اتقاکم** (حجرات:۱۳)۔

سورہ آل عمران میں مرد و عورت کو "**بعضکم من بعض**" کہا گیا ہے، اس کی تفسیر میں مفسرین کہتے ہیں کہ مرد کو عورت سے پیدا کیا گیا اور عورت مرد سے پیدا کی گئی۔ (تفسیر المنار)

لہٰذا دونوں یکساں مقام و مرتبہ کے حامل قرار پائے، دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، البتہ عمل کی بنیاد پر دونوں کا مرتبہ و مقام الگ الگ ہو سکتا ہے رسول اللہ ﷺ نے اسی مفہوم میں یہ بات بھی ارشاد فرمائی: **النساء شقائق الرجال** (ترمذی)

۲- ایمان و عمل میں مساوات

خلقت میں مساوات کا لازمی نتیجہ ہے کہ ایمان اور عمل دونوں میں مرد و عورت یکساں ہیں، اور دونوں کو یکساں بدلہ ملے گا، ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ ایک ہی عمل کو اگر مرد کرے تو ثواب الگ اور عورت کرے تو ثواب الگ، بلکہ دونوں کا ثواب یکساں ہوگا، قرآن کریم میں متعدد آیات میں مرد و عورت کو ایک ساتھ اور ہم مرتبہ پیش کیا گیا ہے، سورہ سورہ نحل (۹۷) میں ہے: **مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً**۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ مرد و عورت دونوں اللہ کے سامنے یکساں جواب دہ ہیں، دونوں کو اپنے اپنے عمل کا جواب دینا ہوگا۔

۳- دینی ذمہ داری میں مساوات

دینی احکام کی ادائیگی، شریعت پر عمل، عمل کے نتیجہ میں جزا و سزا اور تمام دینی ذمہ داریوں میں مرد و عورت دونوں برابر ہیں، سورہ توبہ میں ہے:

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَٰتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَوٰةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَوٰةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ۔ (سورہ توبہ: ۷۱)

اسی سے متصل دوسری آیت میں نیک عمل کے نتیجہ میں دونوں کے لئے "جنت عدن" اور "رضوان" کی بشارت سنائی گئی ہے۔

یہ مساوات کا نتیجہ ہے کہ ہم جنگ کے میدان میں بھی صحابہ کے شانہ بہ شانہ صحابیات کو دیکھتے ہیں، اصولی طور پر صحابہ کو جنگ میں شریک ہونے

اور دشمنوں سے مقابلہ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے، لیکن انہیں اس بات سے منع بھی نہیں کیا گیا ہے۔

بعض دینی احکام میں عورتوں کے ساتھ رخصت کا معاملہ کیا گیا ہے، وہ ان کی صنفی اور طبعی تقاضوں کی بنیاد پر ہے۔

۴-دونوں کے حقوق کی تعیین

اسلام میں مرد اور عورت دونوں کے حقوق کو اس طرح محفوظ کیا گیا کہ دونوں کے فرائض اور ایک دوسرے کے تئیں حقوق بھی متعین کئے گئے، جس طرح عورت پر مرد کے حقوق ہیں اسی طرح مرد پر بھی عورت کے حقوق عائد کئے گئے ہیں، کمزور صنف کے حقوق کے تحفظ کی اس سے بہتر کوئی شکل نہیں ہوسکتی تھی، سورہ بقرہ میں ہے: ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف (بقرہ:۲۲۸)۔

اسی کے ساتھ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی بھی تاکید کی گئی :وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوف (نساء: ۱۹)اور ان (بیویوں) کے ساتھ اچھے طریقے سے زندگی بسر کرو۔

احادیث میں کثرت سے عورتوں کے حقوق کی حفاظت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید آئی ہے، رسول اللہ ﷺ نے مرد کی اچھائی کا معیار ہی عورت کے ساتھ حسن سلوک کو قرار دیا ہے، آپ نے فرمایا: خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ، وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي۔ تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں (خصوصاً بیوی) کے ساتھ بہتر ہو۔

۵-انسانی حقوق میں مساوات

عام انسانی زندگی کے حقوق مثلاً حق زندگی، حق عزت، حق ملکیت ،خرید وفروخت کا حق، ملکیت کا حق تعلیم کا حق، سماجی حقوق مثلاً رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنا، ہبہ کرنا، صدقہ وخیرات کرنا اس طرح کے بے شمار حقوق ہیں جن میں مرد وعورت دونوں برابر ہیں۔ اسلام میں عورت مرد کے تابع نہیں ہے، بلکہ وہ ایک مستقل وجود رکھتی ہے، اس کی اپنی ذات ہے، جو والدین، شوہر یا اولاد کے تابع نہیں ہے، عورت اپنی ملکیت کو جس طرح چاہے صرف کرسکتی ہے، یہ اختیار اور اس طرح کے تمام تر اختیارات صرف اسلام میں دئے گئے ہیں۔

۶-تعلیم وتدریس میں مساوات

اسلام میں پہلے دن سے تعلیم پر توجہ دی گئی ہے، علم اور تعلیم کی اہمیت کا یہ حال ہے کہ پہلی وحی میں ہی اس کا حکم نازل ہوا، چنانچہ علم کے حصول اور علم کی خدمت میں دونوں برابر ہیں، یہی وجہ ہے کہ دور صحابہ سے ہی مردوں کے ساتھ ایسی خواتین کے نام ملتے ہیں جو علم کی خدمت میں معروف تھیں۔

۷-نکاح کے لئے رضامندی میں مساوات

جس طرح مرد کو اپنی پسند سے نکاح کرنے کا حق ہے، اسی طرح عورت کو بھی اپنے شریکِ حیات کے انتخاب کا مکمل حق دیا گیا ہے، یہ اخلاقی اور قانونی دونوں سطحوں پر مساوات کی بہترین مثال ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لَا تُنْكَحُ الْأَيِّمُ حَتَّى تُسْتَأْمَرَ، وَلَا تُنْكَحُ الْبِكْرُ حَتَّى تُسْتَأْذَنَ۔ (بخاری ومسلم)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی آزاد اور واضح رضامندی کے بغیر اس کا نکاح درست نہیں ہوگا، جس کا مطلب یہ ہے کہ ازدواجی رشتے کے قیام میں عورت کو مرد کے برابر فیصلہ سازی کا حق حاصل ہے۔

۸-رشتہ نکاح ختم کرنے کے حقوق

نکاح کے بعد شوہر وبیوی کے درمیان اگر کسی وجہ سے ہم آہنگی نہ ہوسکے اور دونوں ایک ساتھ زندگی گزارنے میں دشواری محسوس کریں تو ایسی صورت میں جہاں مرد کو طلاق کا اختیار دیا گیا ہے وہیں عورت کو خلع اور بعض حالات میں فسخ وتفریق کا بھی حق دیا گیا ہے۔

۹-معاشی حقوق میں برابری

اسلام میں عورت کو شرعی حدود میں رہ کر کمانے، اپنی کمائی پر مکمل اختیار رکھنے اور اپنی مرضی سے خرچ کرنے کا حق ہے، مرد کی طرح عورت بھی معاشی سرگرمیاں انجام دینے کا اختیار رکھتی ہیں، اسلام نے عورت کی ملکیت کو تسلیم کرکے عورت کی عزت کو مستحکم کیا ہے: لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ" مردوں کے لیے ان کی کمائی میں حصہ ہے اور عورتوں کے لیے ان کی کمائی میں حصہ ہے۔

اسلام کی پہلی خاتون حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اپنے دور کی مشہور تاجر تھیں، متعدد صحابیات کے حوالے سے ان کی معاشی سرگرمیوں کا ذکر احادیث اور سیرت کی کتابوں میں ملتا ہے۔

۱۰-سماجی اور خاندانی دائرہ

مساوات کا ایک مظہر یہ بھی ہے حقوق کی تعیین کے بعد دونوں کا دائرہ عمل بھی متعین کردیا گیا، مرد کے لئے معاشی جدوجہد اور خاندان کی سربراہی کا میدان ہے کہ وہ اس جہت میں عورت سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرسکتا ہے، جبکہ عورت کے لئے گھر، بچوں کی پرورش اور اندرون خانہ انتظام و انصرام کا میدان ہے، یہ کام عورت جس طرح انجام دے سکتی ہے مرد نہیں۔

ان تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں مساوات کا مطلب دونوں کو ایک ڈنڈے سے ہانکنا نہیں بلکہ دونوں کو ان کی فطرت اور صنفی رجحان کے مطابق میدان فراہم کرنا ہے ،یہاں مساوات کا مطلب عدل ہے، مرد وعورت دونوں ایک دوسرے کے لئے تکمیلی کردار ادا کرتے ہیں، اس کے برعکس مغرب میں عددی مساوات یا مکمل مشابہت کا نظریہ رائج ہے، اور اس نظریہ کا نتیجہ خاندان کے بکھراؤ، طلاق کی کثرت اور بغیر باپ کے اولاد عنوان سے دیکھا، سمجھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

حق وباطل

فطرت سے بغاوت: جدید تہذیب کا المیہ

ڈاکٹر محمد اعظم ندوی (استاذ المعهد العالی الاسلامی، حیدر آباد)

انسانی تاریخ کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ انسان جب سے اس زمین پر آیا ہے، اُس کی فطری ساخت اور اس پر خالقِ کائنات کی طرف سے عطا کردہ ہدایات کے درمیان ایک مضبوط رشتہ قائم رہا ہے، فطرت سے مراد وہ پاکیزہ، سیدھا اور صحیح مزاج ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو پیدا کیا، یہ فطرت انسان کو خیر وشر، حق وباطل اور نیکی وبدی میں تمیز کرنے کی صلاحیت دیتی ہے، اور اسے اپنے خالق کی طرف راغب کرتی ہے، تاہم، موجودہ دور میں انسانی فطرت کو منظم طریقے سے مسخ کرنے اور اس کے خلاف بغاوت برپا کرنے کی عالمی کوششیں تیز ہوگئی ہیں، اس تناظر میں فطرت کی اہمیت، اس پر ہونے والے حملوں کے محرکات اور اس بغاوت کے ممکنہ نتائج کا جائزہ لیتے رہنا ناگزیر ہے۔

قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں فطرت کی تعریف اور اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ'' (الروم: ۳۰) (اللہ کی اس فطرت کا اتباع کرو جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے، اللہ کی بنائی ہوئی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں)۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ہر بچہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنادیتے ہیں۔''

یہ فطرت درحقیقت انسان کی وہ بنیادی اور صحیح کیفیت ہے جو اسے خالق کی پہچان، اخلاقی امتیاز اور خلقی طور پر صالح راستے کی طرف مائل کرتی ہے۔

تاریخ انسانی میں فطرت کے انحراف کے متعدد نمونے ملتے ہیں، قوم نوح میں شرک کا ظہور اس بغاوت کا پہلا بڑا اعلان تھا، جس نے انسان کو اپنے خالق سے دور کردیا، قوم لوط میں شذوذِ جنس (ہم جنس پرستی) کی صورت میں فطرت کا انتہائی گھناؤنا انحراف سامنے آیا، جس کے نتیجے میں ان پر عذاب نازل ہوا، یونانی اور رومی تہذیبوں میں بھی اسی قسم کی فطری بغاوت عام تھی، جس کے آثار آج بھی ان کی باقیات میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

موجودہ دور میں فطرت کے خلاف بغاوت کو منظم اور عالمی سطح پر فروغ دیا جارہا ہے۔ اس کے چند اہم محرکات درج ذیل ہیں:

۱-سیکولرزم اور مادیت پرستی

جدید مغربی تہذیب نے مذہب کو اجتماعی زندگی سے خارج کر کے ایک ایسی معاشرتی ساخت قائم کی ہے جس کا محور صرف مادی لذت، وقتی فائدہ اور آزادیِ فکر ونظر ہے، اس نظام میں اخلاقیات کی بنیاد مذہبی تعلیمات نہیں، بلکہ عارضی مفاد اور نفسانی خواہشات ہیں۔

۲-انتہا پسندانہ نسائیت

خواتین کے حقوق کی اصل دعوت کو مسخ کرکے ایک ایسی تحریک میں بدل دیا گیا ہے جو صنفی اختلافات کو مٹانے، خاندانی نظام کو کمزور کرنے اور ''جینڈر'' کے نام پر ایک غیر فطری نظامِ زندگی مسلط کرنے پر اصرار کرتی ہے۔

۳-بین الاقوامی اداروں کا کردار

اقوام متحدہ اور اس سے وابستہ ادارے 'انسانی حقوق'، 'مساوات' اور 'آزادی' جیسے خوبصورت نعروں کے ذریعے ایسے بین الاقوامی معاہدے اور قوانین متعارف کروا رہے ہیں جو درحقیقت فطری اقدار، خاص طور پر خاندانی نظام اور صنفی کرداروں کو تباہ کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔

۴-ذرائع ابلاغ اور ثقافتی یلغار

مغربی میڈیا اور ثقافتی برآمدات کے ذریعے فحاشی، عریانی، جنسی بے راہ روی اور شذوذ کو 'ترقی یافتہ' اور 'آزاد خیال' ہونے کی علامت بنا کر پیش کیا جارہا ہے۔ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا نے اس یلغار کو تیز تر کردیا ہے اور ہر فرد تک پہنچا دیا ہے۔

اس کے نمایاں اسباب درج ذیل ہوسکتے ہیں:

الحاد اور مذہب بیزاری کا فروغ: فطری طور پر انسان اپنے خالق کو پہچاننے اور اس کی عبادت کرنے پر مائل ہے، جدید دور میں اس فطری جبلت کو کمزور کرنے کے لیے سائنس اور عقلیت کے نام پر الحاد کو فروغ دیا جارہا ہے۔

خاندانی نظام کا انہدام: شادی اور مستقل رشتوں کی بجائے وقتی تعلقات، آزاد جنسی اختلاط اور ہم جنس پرستی کو معمول بنانے کی کوششیں ہیں، اس سے اولاد کی صحیح تربیت کا ادارہ تباہ ہورہا ہے۔

صنفی ابہام: مرد وعورت کے فطری اور واضح فرق کو مٹا کر ایک مصنوعی 'صنفی سیالیت' (Gender fluidity) کا تصور دیا جارہا ہے، جس کے تحت

انسان کو یہ حق دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنی "صنف" کا تعین کرے، چاہے وہ اس کی پیدائشی حیثیت کے بالکل برعکس ہی کیوں نہ ہو۔

جسمانی اعضاء کی دانستہ مسخ کاری (Body Mutilation): فطرتِ سلیمہ میں انسان اپنے جسم کی حفاظت اور اسے خوبصورت بنانے کا خواہاں ہوتا ہے، آج کل وہم، نفسیاتی مرض یا ''فیشن'' کے نام پر جسم میں ٹیٹو بنوانا، مختلف اعضا کو چھدوانا یا جنسی اعضاء میں تبدیلی کرانا اسی فطری بغاوت کی علامت ہے۔

فطرت کے خلاف چلنے کے نتائج تباہ کن ہیں اور مغربی معاشرے اس کے عملی ثبوت پیش کر رہے ہیں:

-اخلاقی انحطاط: معاشرہ میں بے راہ روی، خودغرضی اور ہرزہ سرائی عام ہوجاتی ہے۔

-نفسیاتی امراض میں اضافہ: غیر فطری طرزِ زندگی ذہنی بے چینی، ڈپریشن اور خودکشی کی شرح میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔-خاندانی انتشار: طلاق کی بلند شرح، بچوں کی بے راہ روی اور بزرگوں کی تنہائی معاشرتی ڈھانچے کو کمزور کرتی ہے۔

آبادیاتی بحران: شادی اور اولاد سے گریز کرنے والے معاشروں میں بزرگ شہریوں کی تعداد بڑھ رہی ہے جبکہ نوجوان نسل کا تناسب کم ہورہا ہے، جس سے معیشت پر دباؤ بڑھتا ہے۔

معنویت کا خاتمہ: زندگی بے مقصد ہو کر رہ جاتی ہے، جس سے وجودی بحران (Existential Crisis) جنم لیتا ہے۔

فطرت سے بغاوت درحقیقت انسان کی اپنی ہستی کے خلاف بغاوت ہے۔ یہ ایک ایسی سمت ہے جو انسانی تہذیب کو تباہی کی طرف لے جا رہی ہے، اس بغاوت کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ:

۱۔فطرتِ سلیمہ کی صحیح تعلیم دی جائے: افراد کو، خاص طور پر نوجوان نسل کو، یہ بتایا جائے کہ انسان کی اصل کامیابی فطری ہدایات کے مطابق زندگی گزارنے میں ہے۔

۲۔مضبوط خاندانی نظام کو فروغ دیا جائے: خاندان انسان کی پہلی درس گاہ ہے، مستحکم خاندان ہی فطری اقدار کو اگلی نسل تک منتقل کر سکتے ہیں۔

۳۔تعلیمی نظام میں اصلاح کی جائے: نصاب میں ایسی تعلیمات شامل کی جائیں جو فطری اقدار کو مضبوط کریں اور جدید چیلنجز کا اسلامی تناظر میں جائزہ پیش کریں۔

۴۔ذمہ دارانہ میڈیا کا فروغ: میڈیا کو فحش اور غیر اخلاقی مواد سے پاک کر کے تعمیری اور فطری اقدار کو اجاگر کرنے والا بنایا جائے۔

۵۔ بین الاقوامی ایجنڈے کے مقابلے میں اسلامی موقف کو مؤثر طریقے سے پیش کیا جائے: عالمی فورمز پر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں انسانی حقوق، خواتین کے حقوق اور خاندان کے تحفظ کے بارے میں واضح اور مدلل موقف اپنایا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے جو فطرت انسان میں ودیعت کی ہے، اس کی حفاظت درحقیقت انسانیت کی حفاظت ہے، اس فطرت سے بغاوت کرنا اپنے وجود کے ساتھ دشمنی ہے، امتِ مسلمہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس عالمی یلغار کے سامنے ڈٹ جائے، اپنی فطری اساس کو مضبوط کرے اور دنیا کو بتائے کہ حقیقی ترقی اور سکون اسی راستے میں ہے جس پر اس کے خالق نے اسے پیدا کیا ہے۔

☆☆☆

بقیہ: تعارف وتبصرہ

پر منتقل کیا، ان کی ترتیب وتنسیق کی، عناوین قائم کیے، کہیں کچھ حصہ ریکارڈنگ میں کم ملا تو چند سطروں سے اس کا تدارک کیا، جن شخصیات کا ذکر آیا' ان کا تعارف کرایا، حوالے ومفید حواشی درج کیے، شخصیات کا انڈکس تیار کیا، محمود بھائی کی شخصیت وحیات پر ایک وقیع تحریر شامل کی اور پھر 'البلاغ پبلیکیشنز لکھنؤ' کے ذریعہ طبع کرا کر قارئین کے سامنے پیش کیا۔

آئیے چار سو صفحات کی اس مجلد اور ضخیم کتاب کے مشمولات کا اندازہ کرنے کے لیے اس کے ابواب کے موضوعات پر ایک نظر ڈالتے چلیں۔

پہلے باب کے خطبات' توحید و رسالت، سیرتِ پاک اور عقیدۂ ختمِ نبوت، مقامِ صحابہؓ، خلفائے راشدین و اہلِ بیت کی فضیلت اور مشاجراتِ صحابہؓ سے متعلق ہیں۔ دوسرے باب کی تقریروں کا موضوع ہے: اصلاحِ معاشرہ اور مسلمانوں کی ذمہ داری، دعوت وتبلیغ اور کام کرنے والوں کے لیے پیغام، قرآن وحدیث کی روشنی میں چند دعائیں، اور بابِ سوم کے بیانات کا محور ہے: چند باکمال علمائے کرام و اساتذۂ عظام، طالبانِ علومِ نبوت اور ان کی ذمہ داریاں۔

ان تمام موضوعات پر یہ تقریریں جن کو شکر کے دانوں کی طرح اکٹھا کر کے تحریری شکل میں پیش کیا گیا ہے' علم کی وسعت، گہرائی اور خود اعتمادی کی غماز ہونے کے ساتھ بیان کی چاشنی بھی رکھتی ہیں۔ اہلِ طلب' ندوہ اور اس کے قریبی کتب فروشوں سے طلب کر سکتے ہیں۔

رابطہ کے لیے: ۹۳۳۵۹۸۲۴۱۳

☆☆☆

ذرائع ابلاغ

ندوہ کے رسائل وجرائد- ادبی وفکری تناظر میں

زین العابدین ہاشمی ندوی (ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ)

ندوۃ العلماء محض ایک دینی درسگاہ یا تعلیمی ادارہ نہیں، بلکہ برصغیر کی فکری، ادبی اور تہذیبی تحریک بھی ہے۔ اس تحریک نے اپنے قیام کے روزِ اول سے یہ بات واضح کردی تھی کہ دین کی بقا چند حدود میں مقید رہ کر ہرگز ممکن نہیں، بلکہ اس کے لیے ادب، صحافت، فکر، دعوت سب کو ایک مربوط نظام میں پرونا صرف ضروری نہیں بلکہ وقت کا تقاضا ہے۔ یہی وہ پس منظر ہے جس میں ندوۃ العلماء کے رسائل وجرائد کو ادبی وفکری تناظر میں دیکھا جانا ضروری ہے۔

مجلہ 'الندوہ'

مجلہ 'الندوہ' دراصل ندوۃ العلماء کا فکری علمی ادبی ترجمان تھا۔ جس کا پہلا شمارہ اگست ۱۹۰۴ء میں شاہجہان پور سے شائع ہوا۔ اس کے بعد ندوۃ العلماء سے شائع ہونے لگا، اولین ایڈیٹر علامہ شبلی نعمانیؒ اور مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانیؒ تھے۔ یہ ایک اعلیٰ تحقیقی وتنقیدی مجلہ تھا جس نے ۱۹۱۲ء تک اشاعت جاری رکھی۔

تقریباً ۲۲ سال کے وقفے کے بعد، یہ جنوری ۱۹۲۱ء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور مولانا عبد السلام قدوائی ندویؒ کی ادارت میں دوبارہ جاری ہوا، مگر صرف تین سال (۱۹۲۴ء) تک چل سکا۔

یہ رسالہ نہ تو محض مذہبی نوعیت کا رسالہ تھا اور نہ ہی عام ادبی رسالوں کی طرح موضوعات کی سطحی رنگارنگی پر قانع تھا۔ الندوہ کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ادب، فکر اور دین تینوں ایک دوسرے میں مدغم نظر آتے ہیں۔

ادبی اعتبار سے الندوہ کی تحریریں ایک سنجیدہ، شستہ اور مقصدی اسلوب کی حامل ہیں۔ یہاں ادب محض لفظی صناعی یا جمالیاتی لذت کے لیے نہیں، بلکہ فکری پیغام کی ترسیل کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس رسالے میں شامل مضامین، مقالات خواہ وہ دینی ہوں یا ادبی ذہن کو بیدار کرتے ہیں اور اسے فکری سطح پر جھنجھوڑتے بھی ہیں۔

مجلہ الندوہ کا بنیادی مقصد اسلامی عقائد اور تاریخِ اسلام کا علمی دفاع، فکری شبہات کا ازالہ اور تعلیم یافتہ طبقے کے سامنے اسلام کی معقول اور مدلل ترجمانی تھا۔

اس دور میں جب مستشرقین اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کو تنقید اور تشکیک کا نشانہ بنا رہے تھے، مجلہ الندوہ پہلا اردو رسالہ ثابت ہوا جس نے ان اعتراضات کا سنجیدہ، تحقیقی اور علمی جواب دیا۔ اس نے محض جذباتی ردِعمل کے بجائے ٹھوس دلائل، تاریخی شواہد اور عالمانہ اسلوب کے ذریعے مستشرقانہ شبہات کو رفع کیا اور علمی دنیا میں اسلامی نقطۂ نظر کو مضبوط بنیاد فراہم کی۔

فکری تناظر میں 'الندوہ' نے قدیم صالح اور جدید نافع کو نہایت متوازن انداز میں پیش کیا۔ ایک طرف اسلامی روایت سے گہری وابستگی، اور دوسری طرف جدید فکری چیلنجز کا ادراک' یہی وہ وصف ہے جو الندوہ کو محض ایک رسالہ نہیں بلکہ ایک فکری دبستان بناتا ہے۔

الندوہ کا ایک اہم مقصد نوجوان اہلِ قلم کی تربیت بھی تھا۔ اس رسالے نے دار العلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ اور نوآموز لکھنے والوں کو تحریر و تصنیف کا سلیقہ عطا کیا۔ بعد کے دور میں جن ندوی فضلاء نے علمی وادبی دنیا میں امتیازی مقام حاصل کیا، ان کی تحریری زندگی کی ابتدا اسی مجلہ سے ہوئی۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ کا علمِ حدیث پر مضمون، جو ان کے زمانۂ طالب علمی میں الندوہ میں شائع ہوا، اس کی نمایاں مثال ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ مجلہ الندوہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس مجلّے نے شاید سیکڑوں برس کے بعد علماء کرام کی سطحِ جامد میں حرکت پیدا کی، اب تک علمائے کرام کے تحقیقاتی مسائل منطق، عقائد اور فقہ کے چند ایسے مسائل پائے جاتے تھے، جن پر گو بہت کچھ لکھا جاچکا تھا۔ پھر بھی جو آتا تھا وہ انہی کو دوہرا دوہرا کر اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرتا تھا۔ منطق وفلسفہ کی بعض درسی کتابوں کی شرحیں لکھنا، تعلیقات لکھنا غیر مفید مناظرانہ مسائل تالیف کرنا، یہ علمائے کرام کے مشاغل تھے حالانکہ زمانے کا رخ ادھر سے اُدھر پھر چکا تھا، اور حالات نے اسلام اور علوم اسلامیہ کی خدمت کی کچھ اور ہی ضروریات پیدا کر دی تھیں، مجلہ الندوہ کا بڑا فیض یہ ہے کہ اس نے علمائے کرام کے خیالات میں انقلاب پیدا کیا۔ علمائے کرام کے سامنے جدید مباحث کا دروازہ کھلا، اسلام اور علوم اسلامیہ کی خدمت کے نئے طریقے ان کو نظر آئے، زبان و بیان کے انداز اور پیرائے معلوم ہوئے، اس کو پسند کرنے والے اور ناپسند کرنے والے دونوں ہی اس کو پڑھ کر اس کے مطابق لکھنے کی کوشش کرنے لگے۔

(ندوۃ العلماء اور صحافت)

اسی طرح مولانا عبد الماجد دریا بادی لکھتے ہیں کہ مجلہ ''الندوہ'' سے میری پسندیدگی ایسی بڑھی کہ میری نگاہ میں دوسرے پرچوں کی اہمیت باقی نہیں رہی۔ (آپ بیتی)

غرض، مجلہ الندوہ نے نہ صرف تحریکِ ندوۃ العلماء کی فکری علمی اور ادبی پیغام کو عام کیا بلکہ اسلامی صحافت کی ایک مثالی، سنجیدہ اور تحقیقی روایت قائم کی، جس نے بعد کے رسائل اور اخبارات کے لیے سمت متعین کی۔

تعمیرِ حیات

تعمیر حیات ندوۃ العلماء کا علمی، فکری و ادبی ترجمان ہے، اس کی اشاعت کا آغاز ۱۰؍نومبر ۱۹۶۳ کو ہوا۔ جس نے ادب کو زندگی کی عملی تشکیل سے جوڑنے کی کامیاب کوشش کی۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس رسالے کا بنیادی مقصد فرد اور معاشرے کی فکری، اخلاقی اور تہذیبی تعمیر تھا، اور یہی مقصد اس کے ادبی مزاج میں بھی پوری طرح جھلکتا ہے۔

ادبی اعتبار سے تعمیر حیات کی تحریریں سادگی، روانی اور مقصدیت کا حسین امتزاج ہیں۔ یہاں زبان نہ تو ثقیل ہے اور نہ ہی تصنع کا شکار، بلکہ قاری سے براہِ راست مکالمہ کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس رسالے نے مضامین، اداریوں اور تبصروں کے ذریعے ادب کو دعوتی اسلوب عطا کیا، جس میں وعظ کی خشکی کے بجائے فکری اپیل کی نرمی پائی جاتی ہے۔

فکری سطح پر'تعمیر حیات' نے آزادی کے بعد کے ہندوستانی سماج میں مسلمانوں کو درپیش تعلیمی، تہذیبی اور سماجی مسائل کو موضوع بنایا۔ یہ رسالہ محض مسائل کی نشاندہی پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ ان کا حل بھی ایک مثبت اور تعمیری انداز میں پیش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعمیر حیات ادب اور فکر دونوں میدانوں میں ندوہ کی نمائندہ آواز بن کر ابھرا۔

مولانا سید محمد الحسنیؒ کے نزدیک مجلہ تعمیر حیات کا اجرا محض ایک صحافتی سرگرمی نہیں تھا بلکہ ایک ہمہ جہت دعوتی اور اصلاحی منصوبہ تھا۔ ان کے مطابق اس رسالہ کا بنیادی مقصد ملت کے فکری و عملی مسائل کو اجاگر کرنا، معاشرے کی ہمہ گیر اصلاح کی کوشش کرنا، ندوۃ العلماء کی فکری اساس کو واضح کرنا اور یہ بتانا تھا کہ بدلتے ہوئے حالات میں اس فکر کی کس قدر ناگزیر ضرورت ہے۔ اسی کے ساتھ تعمیر حیات کے ذریعے نصابِ تعلیم میں اصلاح، قرآن وسنت کی تعلیمات کی ترویج، مسلمانوں کے باہمی اختلافات کے ازالے اور دینی شعور کی بیداری کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔

مولانا سید محمد الحسنیؒ نے اس رسالے کو شہرت یا مقبولیت کے حصول کے لیے نہیں بلکہ خالص جذبۂ دعوت کے تحت استعمال کیا۔ ان کی تحریریں مغربی فکری یلغار، اسلام دشمن تحریکوں اور معاندانہ پروپیگنڈے کے مدلل اور جرات مندانہ جواب کی حیثیت رکھتی تھیں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے تجزیے کے مطابق اس فکری کشمکش نے مولانا محمد الحسنی کے قلم میں غیر معمولی قوت، حرارت اور اثر انگیزی پیدا کر دی۔ ان کا اسلوب محض خطیبانہ جوش نہیں بلکہ علم، دلائل اور تاریخی شواہد سے مزین تھا، جو اسلامی شعور کو بیدار کرنے، احساسِ کمتری کو ختم کرنے اور ملت کے اعتماد کو بحال کرنے میں مؤثر ثابت ہوا۔ یہی اسلوب دنیا کی بڑی اصلاحی تحریکوں میں بیداری اور انقلاب کی راہ ہموار کرتا رہا ہے۔

(ماہانہ دعوۃ الحق-فروری ۱۹۶۵ء)

تعمیر حیات کو خالص معنوں میں ادبی رسالہ کہنا درست نہیں، کیونکہ اس کی اساس تخلیقی ادب نہیں بلکہ دعوت، فکر اور اصلاحِ معاشرہ پر قائم ہے۔ لیکن اس حقیقت کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اس رسالے کا رشتہ ادب سے منقطع کبھی نہیں رہا۔ یہاں ادب کو محض الفاظ کا ہنر نہیں سمجھا گیا بلکہ اسے زندگی کی تعمیر کا ایک مؤثر وسیلہ مانا گیا۔ اسی لیے تعمیر حیات کے صفحات پر فکر انگیز نثر، سنجیدہ اسلوب، ادبی ذوق رکھنے والی تحریریں، ادبی گوشے اور نعتیہ کلام وقتاً فوقتاً جگہ پاتے رہے۔ زبان کی سادگی، بیان کی شفافیت اور مقصد کی وضاحت نے اس رسالے کو ایک ایسا وقار عطا کیا جو خالص ادبی مجلّات ہی کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ یوں اگرچہ تعمیر حیات نے کبھی ادبی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، لیکن اسلامی فکر کے دائرے میں رہتے ہوئے اس نے ادب کو نظر انداز بھی نہیں کیا، بلکہ اسے خاموشی کے ساتھ اپنے فکری سفر کا حصہ بنائے رکھا۔

کاروانِ ادب

کاروانِ ادب ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والا ایک سہ ماہی ادبی مجلہ ہے۔ اس کا پہلا شمارہ جنوری تا مارچ ۱۹۹۵ میں شائع ہوا۔ اس رسالے کا اجرا ''رابطہ ادب اسلامی'' کے زیرِ اہتمام ہوا، جس کے بانی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ تھے۔ یہ رسالہ اردو کے معیاری ادبی مضامین، تنقید اور تحقیقی مقالات کی اشاعت کے لیے مخصوص ہے اور اس کا مقصد اسلامی اقدار سے ہم آہنگ اعلیٰ ادب کو فروغ دینا ہے، یہ رسالہ اس تصور کو مضبوط کرتا ہے کہ ادب محض ذوقی تسکین یا جمالیاتی اظہار تک محدود نہیں، بلکہ زندہ معاشروں میں فکری بیداری اور اخلاقی اصلاح کا ایک مؤثر اور طاقت ور ذریعہ بھی ہو سکتا ہے۔

(باقی صفحہ ۲۳؍پر)

فکر وعمل

تعلیم کا مقصد-خدمت خلق نہ کہ خدمت ذات

محمد ناظم اشرف ندوی (مفتی دارالافتاء ادارہ شباب اسلامی، دہرہ دون)

جب کسی طالب علم سے پوچھا جاتا ہے کہ تعلیم حاصل کر کے تم کیا بننا چاہتے ہو؟ تو عموماً جواب یہ سننے کو ملتا ہے: ”میں ڈاکٹر بنوں گا، انجینئر بنوں گا، سول سروس میں جا کر افسر بنوں گا، عالم، فاضل یا مفتی بنوں گا۔ پھر میں بڑا مقام حاصل کروں گا، عزت پاؤں گا اور اپنی زندگی کو سیٹل کرلوں گا۔“

گویا ہمارے معاشرے میں تعلیم کا مقصد یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ وہ محض مقام، دولت، شہرت اور آسودگی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ حالانکہ اصولی اور فکری اعتبار سے یہ تصور درست نہیں۔ تعلیم اس لیے نہیں ہوتی کہ انسان کچھ بن جائے، بلکہ اصل سوال یہ ہونا چاہیے کہ: ”تم تعلیم حاصل کر کے کیا کرنا چاہتے ہو؟“ اگر یہ سوال درست ہو جائے تو جواب بھی درست سمت اختیار کر لیتا ہے۔ پھر طالب علم یہ کہے گا کہ میں تعلیم اس لیے حاصل کرنا چاہتا ہوں تاکہ میں قوم کی خدمت کر سکوں؛ میں ڈاکٹر بن کر انسانوں کا درد بانٹنا چاہتا ہوں، انجینئر بن کر قوم کی تعمیر میں حصہ لینا چاہتا ہوں، عالم یا مفتی بن کر لوگوں کو اللہ کے راستے سے جوڑنا چاہتا ہوں، اور افسر بن کر عدل و انصاف کو قائم کرنا چاہتا ہوں۔

درحقیقت، تعلیم کا اصل مقصد خدمتِ خلق ہے، نہ کہ محض ذاتی مفاد۔ کسی مفکر کا ایک معروف قول ہے:

"There is no royal road to science"

یعنی علم تک پہنچنے کا کوئی شاہانہ راستہ نہیں ہوتا۔

علم کا راستہ ہمیشہ محنت، مشقت، سادگی اور ایثار سے گزرتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جن لوگوں نے علم حاصل کر کے انسانیت کی خدمت کی، ان کی زندگیاں شاہانہ نہیں بلکہ فقیرانہ تھیں۔ انہوں نے علم کو معاش کمانے کا ہتھیار نہیں بنایا بلکہ خدمت کا وسیلہ بنایا۔

یہ بات درست ہے کہ ہر پیشے کے ساتھ کچھ نہ کچھ معاوضہ وابستہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر علاج کرتا ہے تو فیس لیتا ہے، انجینئر منصوبہ بناتا ہے تو اجرت پاتا ہے، استاد پڑھاتا ہے تو تنخواہ لیتا ہے، عالم و مفتی رہنمائی کرتا ہے تو اس کی کفالت ہوتی ہے۔ مگر یہ سب ضمنی امور ہیں، اصل مقصد نہیں۔

جب خدمت مقصد بن جاتی ہے تو پھر ڈاکٹر ناجائز ٹیسٹ نہیں لکھتا، غیر ضروری آپریشن نہیں کرتا، مریض کو لوٹنے کا ذریعہ نہیں بناتا۔ انجینئر غیر ضروری اخراجات کا بوجھ نہیں ڈالتا۔ افسر اپنے عہدے کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھاتا، رشوت کو گناہ سمجھتا ہے، اور عوام کو اذیت نہیں دیتا۔ عالم دین علم کو بیچنے کی چیز نہیں بناتا بلکہ اسے امانت سمجھ کر آگے پہنچاتا ہے۔

خدمت کے جذبے کے ساتھ کام کرنے والے کے دل میں لوگوں کے لیے ہمدردی، محبت اور خیرخواہی ہوتی ہے، اور یہی وہ روح ہے جو تعلیم کو زندہ رکھتی ہے۔ چنانچہ رسولِ اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ”خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَنفَعُ النَّاسَ“ یعنی لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو لوگوں کے لیے سب سے زیادہ نفع پہنچانے والا ہو۔

اس حدیث مبارکہ میں نبی کریم ﷺ نے انسان کی اصل عظمت اور فضیلت کا معیار واضح فرما دیا ہے۔

اسلام کی نظر میں بہترین انسان وہ نہیں جو زیادہ مالدار ہو، زیادہ طاقتور ہو یا بلند منصب پر فائز ہو، بلکہ بہترین انسان وہ ہے جو دوسروں کے لیے فائدہ مند ہو۔

جو شخص اپنی صلاحیت، علم، وقت اور وسائل کو انسانوں کی بھلائی کے لیے استعمال کرتا ہے، وہی اللہ کے نزدیک محبوب ہے۔ نفع پہنچانا صرف مالی مدد تک محدود نہیں، بلکہ کسی کو صحیح راستہ دکھانا، علم سکھانا، بیمار کا علاج کرنا، مظلوم کی مدد کرنا، غم زدہ کو تسلی دینا، اور لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنا یہ سب نفع کے دائرے میں آتا ہے۔

یہ حدیث ہمیں خودغرضی سے نکال کر خدمت خلق، ہمدردی اور خیرخواہی کی زندگی اختیار کرنے کی دعوت دیتی ہے، اور یہ بتاتی ہے کہ انسان کی کامیابی اسی میں ہے کہ وہ اپنی ذات سے آگے بڑھ کر انسانیت کے لیے فائدہ مند بنے۔

اسی طرح قرآن حکیم میں اللہ رب العزت نے ایک ہمہ گیر اصول بیان فرما دیا ہے، وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (الرعد: ۱۷) (اور جو چیز لوگوں کو فائدہ پہنچاتی ہے، وہی زمین میں باقی رہتی ہے)۔

اس آیتِ مبارکہ میں اللہ رب العزت نے ایک نہایت بلیغ اور ہمہ گیر اصول بیان فرمایا ہے کہ جو چیز لوگوں کے لیے نفع بخش ہوتی ہے وہی زمین میں باقی رہتی ہے، اور جو بے فائدہ ہوتی ہے وہ جھاگ کی طرح مٹ جاتی ہے۔

اس مثال کے ذریعے یہ حقیقت واضح کی گئی کہ دنیا میں بقا اور دوام اسی چیز کو حاصل ہے جس میں نفع، خیر اور فائدہ ہو۔

یہ اصول صرف مادی اشیاء تک محدود نہیں بلکہ اقوال، اعمال، علم، کردار اور نظام زندگی سب پر لاگو ہوتا ہے۔ وہ علم جو انسانیت کے لیے فائدہ مند ہو، وہ

کردار جو لوگوں کے لیے آسانی کا سبب بنے، وہ نظام جو عدل وانصاف پر قائم ہو، یہ سب باقی رہتے ہیں اور تاریخ میں زندہ رہتے ہیں۔

اس کے برعکس وہ علم، وہ عمل اور وہ نظام جو محض ذاتی مفاد یا ظلم پر قائم ہوں، وقتی طور پر چمکتے ضرور ہیں مگر آخر کار مٹ جاتے ہیں۔ یہ آیت ہمیں یہ سبق بھی دیتی ہے کہ انسان اپنی زندگی کو نفع رسانی سے جوڑ دے، کیونکہ فائدہ ہی بقا کی ضمانت ہے، جو انسان لوگوں کے لیے فائدہ منداور نفع بخش بن جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے آثار ونتائج کو باقی رکھتا ہے، اور یہی اصل دنیا اور آخرت کی کامیابی ہے۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینا چاہیے کہ یہ تصور صرف دینی تعلیم تک محدود نہیں، بلکہ دنیا کی ہر تعلیم کا یہی مقصد ہے کہ انسان کے اندر خدمت وخیر خواہی کا جذبہ پیدا ہو۔ البتہ دینی تعلیم کا مقام اس سے کہیں بلند ہے، کیونکہ اس کا اصل حاصل رضائے الٰہی ہے۔ یقیناً انسان کو معاش کی ضرورت ہے، مگر معاش کے لیے ہی تعلیم حاصل کرنا تعلیم کے مقصد کو مسخ کر دینا ہے۔ جو شخص صرف کمائی چاہتا ہے، وہ تجارت کرے، کاروبار کرے، محنت مزدوری کرے، تعلیم کو محض کمائی کا ذریعہ نہ بنائے۔

آج المیہ یہ ہے کہ پورا تعلیمی نظام ہی معاش کا کاروبار بن چکا ہے۔ پہلے تعلیم کے نام پر بھاری رقم خرچ کرو، پھر ڈگری کے زور پر لوگوں کی جیبیں خالی کرو۔ یہ وہ نظام ہے جس نے علم کی روح کو قتل کر دیا اور انسانیت کو نقصان پہنچایا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم تعلیم کے مقصد کو از سرِ نو سمجھیں، اسے خدمت، اخلاق اور انسانیت سے جوڑیں، اور علم دوبارہ رحمت وشفقت اور خیر خواہی وہمدردی کا ذریعہ بن جائے۔

بقیہ: ندوہ کے رسائل وجرائد

ندوہ کی ادبی روایت میں ادب ہمیشہ فکر، دعوت اور تہذیب سے جڑا رہا ہے، اور کاروانِ ادب اسی روایت کا تسلسل ہے۔

ادبی تناظر میں کاروانِ ادب نے نظم، نثر، تنقید اور تبصرے سب کو دعوتی فکر کے ساتھ ہم آہنگ کیا۔ یہاں ادب محض مطالعے کی شے نہیں رہتا بلکہ ایک ایسے فکری سفر کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس میں قاری صرف تماشائی نہیں رہتا بلکہ اس کارواں کا شریک بن جاتا ہے۔ یوں ادب قاری کی فکر، ذوق اور اخلاقی شعور کو بیدار کرنے کا وسیلہ بنتا ہے۔

کاروانِ ادب کے قیام کا پس منظر مولانا علی میاں ندویؒ کی عالمی ادبی بصیرت سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ مولانا کی نگاہ صرف برصغیر تک محدود نہ تھی، بلکہ وہ یورپ اور مغربی دنیا میں تخلیق ہونے والے جدید ادب کے فکری اور اخلاقی اثرات کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ اس دور میں مغرب میں فحش نگاری، اخلاقی اباحیت اور جنس پرستانہ رجحانات پر مبنی ادب کو نہ صرف فروغ حاصل تھا بلکہ ایسے لٹریچر کو بین الاقوامی اعزازات، نوبل پرائز اور دیگر بڑے ادبی انعامات سے بھی نوازا جا رہا تھا۔ ہم جنس پرستی اور الحادی افکار پر مبنی تحریریں عالمی ادب کے نام پر پیش کی جا رہی تھیں۔

مولانا علی میاں ندویؒ کے نزدیک ادب محض ذوقی یا جمالیاتی سرگرمی نہیں تھا بلکہ ایک طاقت ور فکری اور تہذیبی ہتھیار تھا۔ وہ اپنی خودنوشت کاروانِ زندگی میں واضح طور پر اعتراف کرتے ہیں کہ جدید دور میں فکری انتشار، الحاد اور اخلاقی زوال کے فروغ میں فلسفے اور سائنس کے ساتھ ساتھ ادب نے بھی نمایاں کردار ادا کیا، خصوصاً جامعات اور ادبی حلقوں میں۔

(کاروانِ زندگی)

اسی فکری بیداری کے زیرِ اثر مولانا علی میاں ندویؒ نے یہ محسوس کیا کہ اسلامی ادب کو محض انفرادی کوششوں کے بجائے ایک منظم اور ہمہ گیر فکری تحریک کی صورت میں پیش کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ ۱۹۸۴ء میں لکھنؤ کے ایک علمی اجتماع میں ان کی قیادت میں عالمی رابطۂ ادبِ اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ اس تحریک کے اغراض میں ادبِ اسلامی کی نظریاتی بنیادوں کو مضبوط کرنا، ادبی تنقید کے اسلامی اصول مرتب کرنا، جدید ادبی علوم کے لیے مناسب اسلامی مناہج تیار کرنا، عالمی سطح پر اسلامی ادب کی اشاعت وترسیل، بچوں کے اسلامی ادب کی تشکیل اور اسلامی ادباء کے باہمی روابط کو فروغ دینا شامل تھا۔ یہ کوشش محض نظری بحث تک محدود نہ رہی بلکہ عربی ادب میں فکری، اخلاقی اور اصلاحی شعور کے عملی اظہار کا ذریعہ بنی۔ کاروانِ زندگی میں درج شہادت اس حقیقت کی تصدیق کرتی ہے کہ یہ تحریک مولانا کی دیرینہ فکری جدوجہد کا فطری تسلسل تھی۔

یہ بات اب محض ایک دعویٰ نہیں رہی کہ ندوۃ العلماء نے ادب کو زندگی سے الگ کسی تجریدی سرگرمی کے طور پر نہیں برتا، بلکہ اسے فکر، احساس اور تہذیبی شعور کی ہم آہنگ صورت میں پیش کیا۔ الندوۃ، تعمیر حیات اور کاروانِ ادب جیسے رسائل ندوہ کی اسی ادبی بصیرت کے نمائندہ ہیں، جہاں لفظ محض اظہار نہیں بلکہ معنی کی تہذیب اور ذوق کی تربیت کا وسیلہ بنتا ہے۔ یہاں ادب نہ خطابت میں تحلیل ہوتا ہے اور نہ محض جمالیاتی لذت تک محدود رہتا ہے، بلکہ ایک سنجیدہ فکری تجربے میں ڈھل کر قاری کے شعور سے مکالمہ کرتا ہے۔ یہی ادبی توازن اور فکری وقار ندوۃ العلماء کو ایک ایسے ادبی مزاج کی علامت بناتا ہے جو زمانے کی گرد میں بھی اپنی شناخت، تاثیر اور معنویت برقرار رکھتا ہے۔

☆☆☆

زبان وادب

عربی زبان: آفاقیت اور عصری معنویت

ڈاکٹر محمد فرمان ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

۱۸/دسمبر ایک یادگار عالمی دن ہے، اسے عالمی عربی ڈے (**اليوم العالمي للغة العربية**) کے نام سے ہر سال منایا جاتا ہے، اس دن عربی میں پروگرام، سمینار، کانفرنسیں اور سمپوزیم منعقد ہوتے ہیں، اور اس میں حصہ لینے والے عربی زبان کی افادیت و نافعیت، اور عصری معنویت پر اپنے خیالات پیش کرتے ہیں، ۱۸دسمبر ۱۹۷۳ء میں اقوام متحدہ نے عربی زبان کو عالمی زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے، اور اپنی مروجہ زبانوں میں اس کو جگہ دی ہے، ۲۰۱۰ء کے بعد اقوام متحدہ کے ثقافتی ادارے یونیسکو نے ۱۸/دسمبر کو عربی ڈے منانے کا سلسلہ شروع کیا، اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔

زبان رابطہ وتعلق کا ایک ذریعہ ہے، بلکہ صحیح معنوں میں جسم وروح میں اتصال زبان ہی کے ذریعہ ہوتا ہے، زبان صرف اظہار کا ذریعہ اور تبادلہ خیال کا وسیلہ ہی نہیں، بلکہ تہذیب وثقافت کی ترجمان ہے، زبان تاریخی احوال وکوائف کا خزینہ ہے، جب بھی کوئی قوم زوال پذیر ہوتی ہے تو اس کی ایک بنیادی وجہ زبان کی کمزوری اور دوسری زبان کا غلبہ تھا، عربی کے مشہور انشا پرداز و مفکر مصطفی صادق رافعی نے لکھا ہے: **ما ذلت لغة شعب إلا ذل، ولا انحطت إلا كان أمرها في ذهاب وإدبار** (وحی القلم: ج۲/۲۷)

(کسی قوم کی پستی میں زبان کی کمزوری کا بڑا دخل ہے، اور جب بھی زبان کمزور ہوئی ہے تو قوم زوال وادبار کا شکار ہوئی ہے)۔

اس لئے زبان کی حفاظت اہل زبان کی بنیادی ذمہ داری ہے، اس سے صرف الفاظ وحروف، اور کلمات ومفردات ہی محفوظ نہیں ہوتے، بلکہ پورا ثقافتی ورثہ محفوظ ہوتا ہے، اور وہ گردش زمانہ کا شکار نہیں ہوتا ہے۔

عربی زبان قدیم ترین زبان ہے، اس کی قدامت کی ایک دلیل یہ ہے کہ اس کا ادبی سرمایہ پندرہ سو سال سے تسلسل سے پایا جاتا ہے، جبکہ انگریزی، فرانسیسی اور اسپینی زبانیں سات یا آٹھ صدیوں سے پائی جاتی ہیں، عربی زبان کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ الفاظ وکلمات کے لحاظ سے مالا مال زبان ہے، علمائے لغت نے عربی زبان کے استعمال شدہ الفاظ کی تعداد پانچ ملین (پچاس لاکھ) سے زیادہ ذکر کی ہے، جب کہ فرانسیسی زبان کے الفاظ پچیس ہزار ہیں، اور انگریزی زبان کے الفاظ ایک ملین (ایک لاکھ) ذکر کئے جاتے ہیں، اسی طرح عربی زبان کی وسعت کا اندازہ اس کے الفاظ میں باریک فرق سے بھی لگایا جا سکتا ہے، اردو زبان میں پیاس کے لئے صرف پیاس کا لفظ استعمال ہوتا ہے، لیکن عربی میں العطش، الظمأ، الصدی، الأوام، الهيام پانچ الفاظ ہیں، اسی طرح عربی میں شیر کے لئے الاسد، الليث، هزبر، أسامة، ضرغام، ضيغم، وغیرہ الفاظ ہیں، اس سے بڑھ کر یہ کہ قرآن وحدیث کی زبان ہے، اور اہل جنت کی زبان ہے، جنت میں حضرت آدم علیہ السلام کی یہی زبان تھی، اللہ تعالی نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے: **وعلم آدم الأسماء كلها** (اور اللہ نے آدم کو تمام نام سکھائے) مفسرین کے ایک قول کے مطابق تمام زبانیں سکھائی، جن میں عربی زبان سرفہرست تھی، عربی زبان جزیرۃ العرب کے جنوب میں عرصہ سے بولی جاتی رہی، وہی ایسی زبان ہے جو ساری زبانوں پر حکمرانی کررہی ہے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول ہے: **لسان العرب أوسع الألسنة مذهبا وأكثرها ألفاظا**۔ (الرسالۃ: ج۲/۲۵۳)

(عربی زبان وسیع ترین اور الفاظ ومفردات کے لحاظ سے مالا مال زبان ہے)۔

اس لئے عربی زبان کا سیکھنا صرف ایک ثقافتی اور تہذیبی ورثہ سے واقف ہونا ہی نہیں، بلکہ دین و احکام شریعت سے بھی واقف ہونا ہے، اور یہ بنیادی فرائض میں ہے، اگر کوئی شخص دین و شریعت کو نہیں جانتا تو وہ اسلام کی نگاہ میں بڑی کوتاہی کا مرتکب ہے، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے: اگر قرآن کریم کے کسی لفظ کی تحقیق کرنی ہو تو اشعار عرب میں تلاش کرو، کیونکہ عربی اشعار عربوں کی پوری تاریخ ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے: علم حدیث اور علم لغت دونوں ایک دوسرے کے قریب نہریں ہیں، ایک ہی وادی میں بہتی ہیں، ایک عربی شاعر کہتا ہے:

حفظ اللغات علينا فرض كفرض الصلاة
فليس يضبط دين إلا بحفظ اللغات

(المزہر مؤلفہ امام سیوطی: ۲/۳۱۲)

(زبانوں کو یاد رکھنا نماز کے فرض ہونے کی طرح فرض ہے، اس لئے کہ دین کو زبان کی

حفاظت سے ہی محفوظ کیا جا سکتا ہے)۔

معجم اوسط امام طبرانی میں ایک حدیث نقل کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

أحبوا العرب لثلاث : لأني عربي ، والقرآن عربي، و كلام أهل الجنة عربي۔

(عربوں سے تین باتوں کی وجہ سے محبت کرو، اس لئے کہ میں عربی ہوں، اور قرآن عربی زبان میں ہے، اور اہل جنت کی زبان عربی ہے)۔

بلاشبہ عربی زبان شریعت اسلامی کی زبان ہے، اس کا پورا سرمایہ اسی زبان میں محفوظ ہے، اس لئے اس سرمایہ سے استفادہ کے لئے عربی زبان کو سیکھنا اور اس سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے، جس طرح نماز کی صحت کے لئے وضوء ضروری ہے، اور بلند جگہ پر جانے کے لئے زینے اور سیڑھی کی ضرورت ہے، اسی طرح شریعت سے واقف ہونے کے لئے عربی زبان سے واقف ہونا ضروری ہے، کوئی ایمان والا مکمل ایمان والا ہو ہی نہیں سکتا، جب تک وہ عربی زبان میں کمال نہ پیدا کرے۔

علامہ ابن تیمیہ نے اقتضاء الصراط المستقیم میں لکھا ہے:

إن نفس اللغة العربية من الدين ، ومعرفتها فرض واجب ، فإن فهم الكتاب والسنة فرض ، ولا يُفهم إلا بفهم اللغة العربية، وما لا يتم الواجب إلا به فهو واجب (ج۲/۲۰۷)۔

(عربی زبان دین کا حصہ ہے، اور اس کو جاننا فرض ہے، اور قرآن وحدیث کو سمجھنا بھی ضروری ہے، اور یہ بغیر عربی زبان سیکھے حاصل نہیں ہو سکتا، اور یہ اصولی بات ہے کہ جس چیز کے ذریعہ کسی اصل کام کی تکمیل نہ ہو وہ بھی ضروری جاتی ہے)۔

اسی وجہ سے عوام وخواص نے عربی زبان وادب کو سیکھا، اور اس کے سیکھنے کے لئے وہ تمام ذرائع استعمال کئے، جو زبان کو سیکھنے کے لئے ضروری ہیں: سننا، بولنا، پڑھنا، اور لکھنا، اس کے بعد اس کو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے عام کیا، اور اس کی اشاعت کے لئے متنوع پروگرام مرتب کئے، کتابیں لکھیں، متنوع عربی پروگرام منعقد کئے، چنانچہ عربی زبان میں علوم اسلامیہ کا ایک ایسا کتب خانہ تیار ہو گیا، جس کی مثال دوسری زبانوں میں کمیاب ہے، اسی کے ساتھ دیگر علوم وفنون کی کتابیں عربی میں منتقل ہوئیں، اور ان کے افکار ونظریات سے عربی داں طبقہ واقف ہوا، یہ کتابیں بھی اتنی بڑی تعداد میں ہیں، جو حیرت و استعجاب کا باعث ہیں، اسی کے ساتھ ۲۲/عرب ممالک ہیں، جن میں ۱۲/براعظم ایشیا میں ہیں، اور ۱۰/افریقہ میں، جہاں عربی زبان بولی جاتی ہے، ان ممالک میں سعودی عرب، مصر، الجزائر، المغرب، عراق، سوڈان، یمن، سوریہ، تونس، صومالیہ، متحدہ عرب امارات، لیبیا، اردن، لبنان، فلسطین، موریتانیا، عمان، کویت، قطر، بحرین جیبوتی، اتحاد القمر، ان ملکوں میں عربی بولی لکھی، سمجھی اور پڑھی جاتی ہے، ان کے علاوہ پورے عالم اسلام میں جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں، وہاں وہ اسلامی شعائر نماز روزہ وغیرہ ادا کرتے ہیں، تو وہ عربی زبان سے نہ صرف واقف ہیں، بلکہ وہ اپنے روز مرہ کے معمولات میں استعمال کرتے ہیں، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو عربی زبان دنیا کے ایک چوتھائی آبادی کی زبان ہے، اس کے علاوہ ملکی وبین الاقوامی اداروں ومنڈیوں میں ملازمتوں اور نوکریوں کی وجہ سے عربی زبان کو جو عمومیت حاصل ہوئی ہے، وہ اس کی وسعت و آفاقیت کی دلیل ہے۔

عربی زبان کے اندر ایسی وسعت ہے کہ اس کا دامن کبھی نئی ایجادات کے لئے تنگ نہیں ہوا، اس کے لغوی سرمایہ میں اب بھی ایسی گنجائش ہے، جو ہر زمانہ کے نئے تقاضوں کا ساتھ دے سکتی ہے، ضرورت کے مطابق ہر زمانہ میں نئے الفاظ و اصطلاحات وضع کئے گئے، اور مرور زمانہ کے ساتھ وہ تاریخ کا حصہ بن گئے، کسی زمانہ میں فلسفہ اور اس کی اصطلاحات کا غلبہ تھا، اور ان کا دور دورہ تھا، ہر جگہ وہی الفاظ وہی جملے استعمال ہوتے تھے، تو اس وقت ضرورت کی خاطر نئے الفاظ و اصطلاحات ایجاد کئے گئے، اس کی خاطر اکیڈمیاں اور ادارے قائم کئے گئے، اور ماہرین کی کمیٹی تشکیل پائی، جس نے پورے غور وخوص کے بعد نئی ایجادات کے لئے الفاظ وضع کئے اور ان کو دنیا نے تسلیم کیا، عصر حاضر میں بھی ایسے ادارے موجود ہیں، جو زمانہ کی ضروریات کے مطابق نئے الفاظ وضع کرتے ہیں، اور عربی زبان کو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔

عربی سرمایہ پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان میں دو رجحانات ہیں: ایک قدیم عربی کا رجحان، اور ایک جدید عربی کا رجحان، بعض ناقدین کا کہنا ہے کہ عربی زبان میں قدیم وجدید کا کوئی تصور نہیں ہے، مصادر اور افعال قدیم وجدید دونوں کے ایک ہی ہیں، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلوب، طرز نگارش اور زمانے کے تقاضوں کی وجہ سے کچھ الفاظ وضع کئے گئے، اسی طرح زمانہ جاہلیت کا ایک اسلوب تھا، زمانہ اسلامی، اموی وعباسی میں دوسرا اسلوب تھا، عباسی

دور میں سجع وقافیہ کا اسلوب تھا، اور عصر حدیث کا اسلوب سابقہ ادوار کے اسلوب سے الگ ہے، ۱۷۹۸ء میں نپولین بوناپارٹ نے مصر پر حملہ کیا، یہ صرف عسکری اور فوجی حملہ نہیں تھا، بلکہ علمی وفکری حملہ تھا، اس کے بعد عربی زبان وادب میں اسلوب کے لحاظ سے ایک نیا دور شروع ہوا، جس کو عصر النهضة (ترقی کا دور) کہا جاتا ہے، اس ترقی کے دور کا اسلوب یہ ہے کہ إبلاغ معنى الكلام إلى ذهن المخاطب بأسهل أسلوب (مفہوم کلام کو مخاطب کے ذہن تک آسان اسلوب میں پہونچانا)۔

اس موقع پر جو نئی ایجادات سامنے آئیں ان تمام چیزوں کے لئے عربی زبان میں مناسب الفاظ وضع کئے گئے، اس موقع پر بعض افراد اور جماعتوں اور اداروں کی طرف سے عربی زبان کے بجائے فرانسیسی الفاظ کو رائج کرنے کی بات آئی، شاعر النیل حافظ بک ابراہیم نے عربی زبان کی زبانی ایک قصیدہ کہا، جس میں اس کی اہمیت، ضرورت اور افادیت کو عالم آشکار کیا، وہ کہتے ہیں:

وسعت كتاب الله لفظاً و غاية
وما ضقتُ عن آي به وعظات
فكيف أضيق اليوم عن وصف آلة
و تنسيق أسماء لمخترعات

(میں اللہ کی کتاب کے لئے لفظ ومعنی کے اعتبار سے وسیع ہوں، اور اس کی کسی آیت اور نصیحت کو پیش کرنے میں کوئی تنگی میرے اندر نہیں ہوتی ہے، تو آج میں کیسے نئی ایجادات کے لئے الفاظ و اصطلاحات وضع کرنے سے تنگ آسکتی ہوں)۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے لکھا ہے:

''عربی زبان اس وقت ایک زندہ اور طاقتور زبان ہے، عرب ملکوں میں وہ اپنے پورے عروج اور شباب پر ہے، وہ تصنیف وتالیف، خطابت و تقریر، سیاست وصحافت، علم وفلسفہ اور دستور و قانون کی زبان ہے، وہ پورے طور پر نکھر گئی ہے، ہمارے عربی مدارس میں ایک غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ قدیم عربی زبان تفسیر وحدیث وفقہ میں محدود ہے، اور وہ کہیں نہیں پائی جاتی، عربی کے نام سے ایک بالکل جدید زبان ایجاد ہوگئی ہے، جس میں زیادہ تر انگریزی وفرانسیسی کے معرب یا دخیل الفاظ ہیں، اس غلط فہمی نے ہمارے بہت سے علماء اور نوجوانوں کو عربی سے متوحش اور مایوس بنادیا ہے، آپ اگر مجھ پر اعتماد کرسکیں، تو میں پورے وثوق کے ساتھ عرض کروں گا کہ جدید عربی کا کہیں وجود نہیں، اس وقت جو زبان اہل علم واہل قلم شرق اوسط میں استعمال کرتے ہیں، وہ قرآن وحدیث اور جاہلیت واسلام کی زبان سے زیادہ سے زیادہ قریب تر ہے، نئی ضرورتوں کے لئے بھی انہوں نے عربی کے قدیم ذخیرہ اور قرآن و حدیث سے الفاظ نکال لئے ہیں، اس سلسلہ میں انہوں نے جو کام انجام دیا ہے، وہ حیرت انگیز بھی ہے، اور قابل داد بھی، مصر پر نپولین کے حملہ کے بعد سے جو مغربی الفاظ عربی زبان میں داخل ہو گئے تھے وہ ایک ایک کرکے بے دخل کئے گئے، اور ان کی جگہ پر خالص الفاظ رکھے گئے''۔

(پاجا سراغ زندگی: ۱۱۷۔۱۱۸)

عہد عباسی میں الشعوبیة کے نام سے ایک فکری اور معاشرتی تحریک تھی، جو اسلامی فتوحات کے بعد عرب وعجم کے اختلاط وکشمکش کے نتیجہ میں برپا ہوئی، اس نے بظاہر عرب وعجم کی مساوات کا نعرہ لگایا، لیکن پس پردہ عرب دشمنی اس کی خمیر میں داخل تھی، کچھ عجمی شعراء نے اس تحریک کی حمایت کی اور عرب دشمنی پر اشعار کہے، یہ سلسلہ دراز ہوا، اور عرب وعجم کی کشمکش بڑھی اور اس کے خطرناک نتائج سامنے آئے، جس کی ایک طویل تاریخ ہے، اقبال نے اسی مفہوم کو ''سادگی اپنوں کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ'' سے تعبیر کیا ہے۔

عربی زبان میں جدیدیت کا رجحان باقاعدہ ایک تحریک کی شکل میں شروع ہوا، جس کو الحداثة کا نام دیا گیا ہے، جس کا مقصد قدیم وجدید عربی کے نظریہ کو فروغ دینا ہے، اور ایک نئی عربی کو جود میں لانا ہے، انگریزی تعبیرات، فرانسیسی استعارات کو داخل کرنا ہے، مشہور ادیب وانشاء پرداز حضرت مولانا سید عبد اللہ عباس ندویؒ نے ایک مضمون'' عربی زبان میں جدیدیت کا رجحان'' لکھا ہے، جو ان کے مجموعہ مقالات نگارشات میں ص ۱۴۴۔۱۵۵ پر شائع ہوا ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں:

''الحداثة صرف نظم ونثر میں قدیم سانچوں سے بغاوت کا داعی نہیں، بلکہ زبان کے اس ڈھانچہ کو ختم کرنے کا مدعی ہے، جو قرآنی عربی کی ساخت ہے جدیدیت کے رجحان کا ارتقائی نقطہ سردست الحداثة کے نام پر عربیت کی شکل کو مسخ کرنے کی کوشش ہے۔ جو حضرات ان تحریکات کا صحیح رخ اور ان کے کام کی رفتار دیکھنا چاہیں وہ منیف موسی کی نظرية الشعر اور ماروت عبود کی على المحک، اور عبد اللہ القصیبی کی هذه هي الأغلال کو دیکھیں''۔

خلاصہ یہ کہ عربی زبان ایک آفاقی زبان ہے، اس کی معنویت کل کی طرح آج بھی مسلم ہے، اور تا قیامت زندہ وتابندہ رہے گی۔

☆☆☆

تسلیم واطاعت

فرض شناسی: فلاح کی شاہ کلید

محمد جاوید اختر ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

اسلام ایک ایسا دین ہے جو انسان کو نہ افراط میں مبتلا کرتا ہے اور نہ تفریط میں، بلکہ ایک متوازن، واضح اور قابلِ عمل راہ دکھاتا ہے، اس دین کی اساس چند بنیادی فرائض اور چند قطعی ممنوعات پر قائم ہے، اگر انسان ان فرائض کو دیانت داری سے ادا کرلے اور حرام سے اپنے آپ کو بچالے جائے تو شریعتِ مطہرہ کی رو سے وہ فلاحِ ابدی یعنی جنت کا مستحق ہوجاتا ہے۔ اس حقیقت کو نبی کریم ﷺ نے نہایت اختصار، وضاحت اور حکمت کے ساتھ ایک عظیم حدیث پاک میں بیان فرمایا:

عن جابر بن عبد الله رضي الله عنه قال: سأل رجل النبي صلى الله عليه وسلم فقال: أرأيت إذا صليت الصلوات المكتوبات، وصمت رمضان، وأحللت الحلال، وحرّمت الحرام، ولم أزد على ذلک شیئاً، أ أدخل الجنة؟ قال: نعم۔ [صحیح مسلم، کتاب الایمان، ۱۵] (ایک شخص نے نبی ﷺ سے عرض کیا: اگر میں فرض نمازیں ادا کروں، رمضان کے روزے رکھوں، حلال کو حلال جانوں، حرام کو حرام مانوں، اور اس کے علاوہ کچھ نہ کروں، تو کیا میں جنت میں داخل ہوجاؤں گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں!)۔

اس حدیث میں اسلام کے دو بنیادی تقاضوں کا ذکر ہوا ہے، اور یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ کوئی مسلمان ایسا نہیں جس کی زندگی میں ان کا دخل نہ ہو، دین اسلام کے ارکانِ خمسہ (شہادت، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ) میں سے صرف نماز اور روزے کا ذکر آیا ہے، اور اس کے ساتھ حرام وحلال کا تذکرہ ہوا ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ چیزیں ہیں جنہیں ادا کرنے کا موقع ہر مسلمان کو میسر آتا ہے، کلمہ شہادت تو ادا کر کے ہی انسان دائرۂ اسلام میں داخل ہوتا ہے اور بقیہ ارکانِ اسلام میں زکوٰۃ اور حج کی باری تب ہی آئے گی جب انسان صاحبِ نصاب و استطاعت ہوگا، لہٰذا ان کو ادا کرنا اس وقت تک اس کے اوپر فرض نہیں ہوتا جب تک وہ صاحبِ نصاب و استطاعت نہ ہوگا۔ باقی رہ گئے نماز اور روزہ، تو ان میں بھی روزہ ایسا فرض ہے جس کا ادا کرنا ایک سال بعد متوقع ہوتا ہے، اب ان تمام فرائض وارکان میں سے اگر کوئی فرض اور رکن ایسا باقی رہ جاتا ہے جس کا تعلق انسان کے شب وروز سے ہے تو وہ نماز ہے، لہٰذا اس فرض کو ادا کرنا ہی ایسی چیز ہے جو ایک مسلمان کے اسلام وایمان کی نشانی ہوسکتی ہے اور اگر کوئی یہ بھی ادا نہیں کرتا تو اس کے اندر اسلام کی کون سے خوبی رہ جاتی ہے، جس کی بنا پر وہ یہ دعویٰ کرے کہ میں مسلمان ہوں؟!

نماز کے ساتھ دوسری چیز صحابیؓ نے جو ذکر کی ہے، وہ اگرچہ ارکان اسلام میں شامل نہیں، تاہم اس کی اہمیت ایک رکن جیسی ہے، یہ چیز حرام کو حرام سمجھتے ہوئے ترک کردینا اور حلال کو حلال جانتے ہوئے استعمال کرنا ہے، حلال ایسی چیز ہے جس کے فعل وعمل کا مطالبہ فرائض میں شامل نہیں، بلکہ انسان کے ارادہ واختیار پر منحصر ہے کہ وہ جس حلال کام کو چاہے اور جس حلال چیز کو چاہے استعمال کرے، لیکن اس کے مقابلے میں حرام سے اجتناب کا مطالبہ فرض ہے اور اس فرض کا تارک اور اس امر کا مرتکب گناہ کبیرہ کا مجرم ہوجاتا ہے۔

حدیث شریف میں صرف فرض نماز کو ادا کرنے اور حرام سے اجتناب پر عمل کے ذکر کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اسلام کے دیگر فرائض اور تقاضے مسلمانوں سے ساقط ہوجاتے ہیں، بلکہ یہاں صرف اس بنیادی اصول کی بات کی گئی ہے، جو جنت میں داخلے کے لیے کم از کم لازمی تقاضہ کے طور پر ہر مسلمان کی زندگی میں پیش نظر رہتا ہے، باقی سب فرائض ومطالبات کو ادا کرنے کا اگر کسی شخص کی زندگی میں کوئی موقع نہیں آتا تو یہ دو امور تو ایسے ہیں جن سے کسی مسلمان کو مفر نہیں، اور جو شخص ان امور کو انجام دے لے گا وہ جنت میں داخلہ کا حقدار قرار پائے گا۔

یہ مختصر مگر جامع حدیث دراصل دینِ اسلام کے پورے عملی ڈھانچے کو چند جملوں میں سمو دیتی ہے، اس میں نجات کا راستہ پیچیدہ عبادات یا ناقابلِ عمل ریاضتوں میں نہیں، بلکہ فرائض کی پابندی اور حرام سے اجتناب میں بتایا گیا ہے۔

اسلام عام آدمی کے لیے دین کو بوجھ نہیں بناتا، بلکہ کم سے کم ذمہ داریوں کے ساتھ جنت کا راستہ کھلا رکھتا ہے۔ یہی اسلام کی رحمت، وسعت اور آسانی ہے۔ آج کا انسان اکثر یہ سمجھتا ہے کہ دین پر چلنا بہت مشکل ہے، یا یہ کہ نجات کے لیے غیر معمولی عبادات لازم ہیں۔ حدیثِ جابرؓ اس غلط فہمی کو دور کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ:

دینداری کا معیار کامل اطاعت وتسلیم ہے، اصل کامیابی فرض شناسی اور حرام سے پرہیز میں ہے، جنت خواص کے لیے نہیں، بلکہ ہر سچے اور فرمانبردار مسلمان کے لیے ہے، یہ دین کا جمال، رحمت ووسعت اور فلاح ونجات کا روشن ثبوت ہے، اور یہی وہ پیغام ہے جس کی آج انسانیت کو سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

☆☆☆

رسید کتب

تعارف وتبصرہ

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

نام کتاب: ایک ہفتہ بنگلہ دیش میں

از: فیصل احمد ندوی

دار العلوم ندوۃ العلماء کے شعبۂ تدریس میں ہمارے رفیقِ کار اور فضلائے ندوہ میں ہمارے سینیر مولانا فیصل احمد بھٹکلی صاحب دار العلوم ندوۃ العلماء کے مایہ ناز اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں، اور اپنے تحقیقی مزاج اور تصنیفی کاموں کی وجہ سے اہلِ علم کے حلقہ میں معروف ہیں۔ انھوں نے کچھ عرصہ قبل سیرتِ نبوی کے ایک پروگرام میں شرکت کی غرض سے بنگلہ دیش کا سفر کیا تھا، جس کی روداد انھوں نے ایک متوسط رسالہ کی شکل میں تحریر کی، جو اس وقت ہمارے دستِ مطالعہ میں ہے۔

سفر بہت سے لوگ کرتے ہیں؛ لیکن عوام و خواص کے سفر، اس کے اغراض و مقاصد اور مشاہدات میں کافی فرق ہوتا ہے۔ مولانا فیصل بھٹکلی ندوی صاحب نے اپنے علمی و تحقیقی ذوق کی وجہ سے اس رودادِ سفر میں عمدہ اور دلچسپ معلومات پیش کی ہیں، جو سب کے پڑھنے کے لائق ہیں اور سب ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ انھوں نے اس سفر میں ایک ہفتہ گذارا، اور ملک کے چاروں اطراف میں سفر کیا، وہاں کی شخصیات سے ملاقاتیں کیں، لائبریریاں دیکھیں، علمی و تحقیق کاموں سے روشناس ہوئے، اور تعلیمی و تربیتی اداروں کا دورہ کیا، اور ساتھ میں ملک کے اقتصادی و سیاسی نظام اور وہاں کے باشندوں کے اخلاق وصفات پر بھی نگاہ ڈالی۔

مولانا موصوف نے اپنے دورہ کے مشاہدات خیالات اور تاثرات کا اظہار بڑی صاف گوئی کے ساتھ کیا ہے۔ ان کے اس سفرنامہ کے مطالعہ سے اس ملک کے اہم عصری و دینی تعلیمی اداروں، کتب خانوں اور علمی و تحقیقی کاموں کے ساتھ اہم ملی شخصیات اور تحریکوں کا ایک اجمالی تعارف حاصل ہوتا ہے، اور یہ بھی جان کر خوشی ہوتی ہے کہ مولانا موصوف کی شخصیت ان کی تصنیفات و تالیفات کے ذریعہ وہاں پہلے سے متعارف تھی، اور ان کی متعدد کتب کا بنگالی زبان میں ترجمہ بھی ہو چکا تھا، جس کی وجہ سے ان کو پذیرائی ملی اور سفر کے مقاصد کے حصول میں آسانی ہوئی۔

عام کتابی سائز کے تقریباً سو صفحات پر مشتمل یہ رسالہ معلومات افزا ہے۔ امید ہے معلومات کی جستجو اور مطالعہ کا شوق رکھنے والے حضرات اس سے استفادہ کریں گے۔

'ادارہ احیائے علم و دعوت' کے اہتمام سے 'مکتبۃ الشباب العلمیۃ، لکھنؤ' سے شائع ہوئی ہے۔

رابطہ کے لیے:

۹۱۹۸۶۲۱۶۷۱، ۹۶۹۶۴۳۷۲۸۳

نام کتاب: تحفظِ ختمِ نبوت اور ندوۃ العلماء

از: رحمت اللہ ندوی

عصرِ حاضر میں جو گمراہ فرقے اسلام کے عقائد و شرائع کو مسخ کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں، ان میں قادیانی فرقہ بہت نمایاں ہے، جس کو اسلام کے بنیادی عقائد میں شامل ختمِ نبوت کے عقیدہ کے انکار کرنے کی بنا پر اسلام سے خارج قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دشمنانِ اسلام کی پشت پناہی کی وجہ سے اس کو بڑی تقویت ملی ہے، اور اہلِ اسلام کی ایک بڑی جماعت اس سے متاثر ہو کر گمراہ ہو چکی ہے، اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

پچھلی صدی کے اوائل میں جب یہ فتنہ ہندوستان میں وجود میں آیا تو علماء اسلام نے اس کا علمی تعاقب کیا، اور اپنی تصنیفات و تالیفات اور مناظروں کے ذریعہ احقاقِ حق کا فریضہ انجام دیا۔ اب بھی یہ فتنہ وقفہ وقفہ سے سر اٹھاتا رہتا ہے؛ بلکہ اس نے نئے نئے روپ دھار لیے ہیں، اور نت نئی شکلیں اختیار کر لی ہیں، لہٰذا اہلِ علم اس کی سرکوبی کے لیے کوششیں کر رہے ہیں۔

اسی طرح کی ایک کوشش دار العلوم ندوۃ العلماء میں کلیۃ الشریعۃ کے استاذ محترم جناب رحمت اللہ ندوی صاحب نے بھی کی ہے، اور "تحفظِ ختم نبوت اور ندوۃ العلماء" کے نام سے ایک رسالہ تصنیف کیا ہے، جو بڑا تحقیقی اور مفید ہے۔ اس رسالہ کا عنوان گرچہ ختمِ نبوت کے باب میں ندوۃ العلماء کی خدمات سے منسوب ہے، جس میں اہلِ ندوہ بالخصوص مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات و تالیفات اور جہد و مساعی کا ذکر ہے؛ لیکن اس کے اندر قاری کو قادیانیت کی تاریخ اور اس کے رد میں لکھے گئے ہندوستان کی دیگر علمی شخصیات کے مختلف رسائل اور تصنیفات کے حوالے، اقتباسات اور مباحث کا ذکر بھی ملے گا۔ اس لحاظ سے اس موضوع پر حسنِ ترتیب اور باسلیقہ پیش کش کے ساتھ یہ رسالہ بڑا جامع و مدلل اور کافی و شافی ہے۔

نام کتاب: درسِ نورانی

از: مولانا حبیب اللہ قاسمی

مرتب: مولانا سلیم احمد قاسمی اوماہی

کتاب کا پورا نام ''درسِ نورانی بموقع ختمِ بخاری'' ہے۔ یہ درسِ ختمِ بخاری شیخ الحدیث جامعہ کاشف العلوم، چھٹمل پور مولانا حبیب اللہ قاسمی نے مغربی بنگال کے ایک مدرسہ 'جامعہ اسلامیہ فاطمۃ للبنات' ٹیسور ضلع بردوان ختمِ بخاری کی تقریب میں دیا، اور اس کو ترتیب دینے والے، اور تنقیح اور اضافہ کے ساتھ پیش کرنے والے مولانا سلیم احمد قاسمی اوماہی صاحب ہیں، جو 'فیض الرشید، اوماہی' کے صدر اور 'مرکز معارف الصفہ، کوٹہ' سہارنپور کے مدیر ہیں۔

اسلام میں اللہ کے کلام قرآن مجید کے بعد دوسرا شریعت کا سب سے بڑا مصدر حدیثِ پاک ہے، اور حدیث پاک کی سب سے زیادہ معتبر اور مستند کتاب 'صحیح البخاری' ہے، جس کو 'اصح الکتب بعد کتاب اللہ' کہا جاتا ہے۔ اس لیے اس کتاب کو اہلِ اسلام کے نزدیک غایت درجہ اہمیت حاصل ہے، اس کے پڑھانے والے کو 'شیخ الحدیث' کہا جاتا ہے، اور اس کے درس کے افتتاح اور اختتام کے وقت بڑا اہتمام کیا جاتا ہے، اور اس فن کی بڑی شخصیات کو دعوت دی جاتی ہے، جو اس کتاب کے اسرار و رموز کو بیان کرتی ہیں، اور اس میں مخفی علمی خزانوں کا پتہ دیتی ہیں۔

صحیح بخاری میں 'ترجمۃ الباب' کی بحث اپنا ایک الگ ہی مقام رکھتی ہے، اور ختمِ بخاری کے درس میں بخاری کے آغاز و خاتمہ کا موضوع بھی بڑے خاصہ کی چیز ہے۔ اس کے علاوہ حدیث کی سند، حدیث کے لفظیات کی بحث، ابواب میں ربط، امام بخاری کی شخصیت اور محدث کے اوصاف وغیرہ بھی اس درس کا خاص موضوع ہوتے ہیں۔

کہنے کو بخاری کے آخری درس میں آخر کی ایک دو حدیثیں پڑھی جاتی ہیں؛ لیکن اہلِ علم جب اس پر مختلف زاویوں سے کلام کرتے ہیں تو وہ درس محض ترجمہ و تشریحِ حدیث نہیں رہ جاتا؛ بلکہ مختلف علوم وفنون اور بے شمار مباحث کا ایک حسین گلدستہ بن جاتا ہے۔

ایسے ہی ایک حسین گلدستۂ علوم وفنون کا اگر آپ مشاہدہ کرنا چاہیں تو اس درسِ بخاری مسمی بہ درسِ نورانی کا مشاہدہ کرلیں۔ درسِ حدیث اور وہ بھی درسِ بخاری میں وہ کونسا پہلو ہے جو اس میں موضوعِ بحث نہ بنا ہو۔ قاری اس بات سے دھوکہ نہ کھائے کہ یہ درس جامعہ اسلامیہ للبنات' ایک بچیوں کے مدرسہ میں ہوا ہے، فی الواقع یہ درس تقریباً سوا دوسو صفحات کی ایک مجلد کتاب میں جا کر سمایا ہے، جس میں ایک ایک لفظ کی مختلف جہات سے تحقیق کی گئی ہے۔ جو لوگ ذوق رکھتے ہیں' ان کے لیے یہ بڑے خاصہ کی چیز ہے۔

'رحمت ایجوکیشن ویلفیر سوسائٹی' چھٹمل پور ضلع سہارنپور سے شائع ہوکر سہارنپور، دیوبند وغیرہ کے کتب فروشوں کے یہاں دستیاب ہے۔

رابطہ کے لیے:

۸۲۷۹۶۲۲۴۰۵، ۶۳۹۸۶۲۲۱۷۷

نام کتاب: خطباتِ محمود

مرتب: محمد سلمان بجنوری ندوی

زیرِ نظر کتاب ہمارے محسن وکرم فرما، ہمارے بڑوں کے منظورِ نظر، ایک صاحبِ اسلوب قلم کار اور صاحبِ طرز خطیب، بہترین معلم و مربی، ماہرِ تاریخ نویس، منفرد سوانح نگار، اعلی اخلاق و صفات کے حامل جناب محمود حسن حسنی رحمہ اللہ کے خطبات کا مجموعہ ہے۔

مولانا محمود حسن حسنی کو اللہ تعالی نے بہت جلد اپنے جوارِ رحمت میں بلالیا۔ وہ بلا کے ذہین، معاملہ فہم اور غیر معمولی قوتِ یادداشت کے مالک تھے۔ گرچہ ان کو ایک فنی خطیب کے طور پر جانا نہیں گیا؛ لیکن جب وہ ڈائس پر آتے تو بے تکان گفتگو کرتے، دینی و تاریخی موضوعات پر ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا، اور جب وہ بولنا شروع کرتے تو گویا کتابوں کے صفحے ان کے سامنے کھلے ہوتے۔ بالخصوص بزرگوں کی باتیں، ان کے احوال ان کو بکثرت یاد تھے، اور تحریر ہو یا تقریر' ان کے استحضار میں ان کو دقت پیش نہیں آتی تھی۔ وہ صالح وتقوی شعار تھے، اس لیے صلاح وتقوی کی باتیں ان کو خوب یاد رہتی تھیں، اور جب وہ بیان کرتے تو دوسروں پر اثر کرتی تھیں۔ انھوں نے جب بھی بیان کیا یا تقریر کی، سامعین پر ایک اثر چھوڑا اور وہ کیف وحال میں نظر آئے۔

اس دعوی کی سچائی اگر آپ جاننا چاہتے ہوں تو 'خطباتِ محمود' کا مطالعہ کریں، جس میں آپ کو ان کے وسیع الثقافۃ ہونے کے ساتھ' زبان میں تاثیر بھی محسوس ہوگی، ان کی معلومات پر حیرت ہوگی، اور ان کے اندر کی سچائی کا اثر ہوگا۔

مبارکباد کے مستحق ہیں جناب محمد سلمان بجنوری ندوی صاحب، جو دار العلوم ندوۃ العلماء کے استاذ ہیں، کہ انھوں نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ پہلے انٹرنیٹ اور دیگر شخصی ذرائع سے اچھی خاصی تعداد میں محمود بھائی کی تقریریں جمع کیں، پھر خود اور اپنے بعض شاگردوں کے ذریعہ ان کو صفحۂ قرطاس...

(باقی صفحہ ۱۹/ پر)

عدل وانصاف

چنگیزیت کے بدلتے روپ

محمد نفیس خان ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

چنگیز خان نے بڑے غرور کے ساتھ اور اقتدار کے زعم میں کہا تھا:

"جس طرح آسمان پر دو آفتاب نہیں رہ سکتے، اسی طرح زمین پر دو خاقان بھی نہیں رہ سکتے۔"

یہ فقرہ محض ایک فاتح کی للکار یا جنگی اعلان نہیں تھا، بلکہ طاقت کے اس ہمہ گیر تصور کا نچوڑ تھا جس میں غلبہ خود ہی حق بن جاتا ہے اور طاقت خود اپنے لیے دلیلیں تراش لیتی ہے۔ اس ایک جملے میں اقتدار کی وہ مطلق العنان منطق سمٹ آئی تھی جو ہر قسم کے اختلاف کو فطرت کے خلاف اور کسی بھی اشتراک کو کمزوری سے مشروط سمجھتی ہے۔ تاریخ نے اسی فکری رویے کو بعد میں "چنگیزیت" کا نام دیا یعنی وہ ذہنیت جس میں طاقت اخلاقی حدود سے آزاد ہو کر خود کو ایک کائناتی قانون کے طور پر پیش کرتی ہے۔

چنگیزیت طاقت و غلبہ کی اس ذہنیت کی علامت ہے جو خود کو قانون، اخلاق اور انسانیت سے ماورا سمجھتی ہے۔ یہ وہ فلسفہ فکر ہے جو اقتدار کو ہی حق اور غلبے کو ہی عدل قرار دیتا ہے، اور جس کے نزدیک انسان محض ایک عدد، تہذیب محض ایک رکاوٹ، اور علم محض ایک خطرہ ہے!

چنگیزیت کی عمارت ظلم اور خوف پر استوار کی گئی تھی، مگر یہ خوف کسی وقتی دہشت یا اچانک ہیجان کا نام نہ تھا؛ بلکہ اقتدار کو مستحکم رکھنے کی ایک شعوری، مستقل اور منظم حکمت عملی تھی۔ چنانچہ شہر کے شہر صرف اس لیے راکھ نہیں کیے گئے کہ انہیں فتح کرنا تھا، بلکہ اس لیے بھی کہ طاقت اور اقتدار کا پیغام دور دراز خطوں تک پہنچ جائے، تاکہ مزاحمت کا تصور جنم لینے سے پہلے ہی دم توڑ دے۔ بستیاں صرف جنگی تقاضوں کے تحت برباد نہیں کی گئیں، بلکہ اس تباہی کے ساتھ ایک نفسیاتی اعلان بھی وابستہ تھا کہ انسانی دلوں میں خوف راسخ ہو جائے اور اطاعت ایک ناگزیر مقدر بن جائے۔

لاشیں محض معرکوں کا اتفاقی نتیجہ نہیں تھیں، بلکہ اقتدار کی بنیادوں میں چنی ہوئی خون آشام اینٹیں تھیں، اور سیکڑوں میل تک پھیلی ویرانیاں خالی میدان نہ تھیں؛ وہ سلطنت کے سب سے بلند ونمایاں مینار بن گئیں۔

یوں تباہی ایک حادثہ یا جذباتی انتقام نہ رہی، بلکہ ایک باقاعدہ سیاسی منطق، ایک آزمودہ حکمت عملی اور ایک مستقل طرزِ حکمرانی کا حصہ بن گئی، خوف و دہشت محض ہتھیار نہ رہا بلکہ وہ قانون کی حیثیت اختیار کر گیا۔

یہ وہ دور تھا جب انسانی جان، انسانی تہذیب اور علم و شرافت سب طاقت کے سامنے بے وقعت ہو گئے تھے؛ مرو، نیشاپور اور بغداد جیسے علم وثقافت کے عظیم مراکز کی تباہی محض شہروں کا زوال نہ تھا؛ بلکہ انسانی شعور پر گہری اور کاری ضرب تھی۔ کتابوں کا دریاؤں میں بہایا جانا دراصل یہ اعلان تھا کہ اقتدار کے سامنے علم وحکمت کی کوئی قیمت نہیں۔

چنگیزیت نے ثابت کر دیا کہ جب طاقت اخلاق سے آزاد ہو جائے تو وہ انسان کے وجود کو بھی غیر ضروری سمجھنے لگتی ہے، انسانی خون کو محض ایک رنگ اور انسانی جذبات کو محض ایک رکاوٹ خیال کرتی ہے۔ اس کے نزدیک آنسو کسی المیے کی علامت نہیں بلکہ کمزوری کا ثبوت بن جاتی ہے، آہیں اور سسکیاں انصاف کی پکار نہیں بلکہ اقتدار کی راہ میں بے معنی شور قرار پاتی ہیں۔

مگر تاریخ کا ستم دیکھیے! وہ چنگیز خان، جس نے اپنے خوف اور بربریت کی حکومت لاکھوں میل تک پھیلائی، جس کی فتوحات نے براعظموں کو لرزا دیا تھا، جس کا نام خوف کا رمز بن چکا تھا وہ جب مرا تو منگولیا کے کسی گمنام و پراسرار خطہ میں دفن کر دیا گیا، دفن کرنے والے سپاہیوں کو قتل کر دیا گیا، پھر ان قاتلین کو بھی مٹا دیا گیا، قبر کے خطہ کو ہزاروں گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند دیا گیا، اس رخ پر دریا کو موڑ دیا گیا اور درخت کے درخت لگا دیے گئے تاکہ اس اس کی قبر ہمیشہ ہمیش کے لیے بے نام ونشاں ہو جائے۔ اور اس کی سلطنت جو اپنی وسعت میں آسمان کو چھوتی تھی، چند دہائیوں میں بکھر کر قصۂ پارینہ بن گئی۔

چنگیز خان تو مر گیا مگر چنگیزیت؟ وہ مر کر بھی زندہ رہی، اور اپنا روپ بدلتی رہی۔ جیسے جیسے زمانہ بدلا، چنگیزیت نے بھی اپنے ہتھیار بدل لیے۔ وہ دور گزر گیا جب لشکر گھوڑوں پر سوار ہو کر شہروں پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ آج طاقت کہیں زیادہ مہذب، کہیں زیادہ پیچیدہ اور کہیں زیادہ خطرناک صورت میں سامنے آتی ہے۔ اب نہ شہر جلائے جاتے ہیں، نہ میناروں پر لاشیں لٹکائی جاتی ہیں، اب قوموں کو معاشی طور پر مفلوج کیا جاتا ہے، ذہنی طور پر محکوم بنایا جاتا ہے، اور اخلاقی طور پر تباہ کیا جاتا ہے!

آج کی چنگیزیت بموں کی گھن گرج سے زیادہ خاموش ہے، مگر اس کا اثر کہیں زیادہ گہرا ہے۔ اب فیصلے میدانِ جنگ میں نہیں، بلکہ کانفرنس ہالز میں ہوتے ہیں۔ اب قتل تلوار سے نہیں، پابندیوں سے کیا

جاتا ہے۔ اب غلامی زنجیروں سے نہیں، قرضوں، بیانیوں اور ترقی کے وعدوں سے مسلط کی جاتی ہے۔ پہلے خوف آنکھوں میں دکھائی دیتا تھا، آج وہ قانون کی زبان میں بولتا ہے۔ یہ جدید چنگیزیت خود کو جنگ نہیں کہتی؛ وہ امن کے نام پر آتی ہے۔ وہ اپنے قدموں کے نشان جمہوریت، انسانی حقوق اور عالمی مفاد کے عنوانات کے نیچے چھپا لیتی ہے۔

طاقتور اپنی برتری کو اصول بنا لیتے ہیں، اور کمزوروں کی تباہی کو ''ناگزیر نقصان'' کہہ کر تاریخ کے حاشیے میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ یوں ظلم اب چیختا نہیں، مسکراتا ہے، دلیل دیتا ہے، اور اخلاق کا لبادہ اوڑھ کر عدل کی صفوں میں شامل ہو جاتا ہے۔

یہ ذہنیت صرف عالمی سیاست تک محدود نہیں رہتی؛ یہ سماجوں کے داخلی ڈھانچوں میں بھی سرایت کر جاتی ہے۔ کہیں نصاب تعلیم سوال کرنے کی صلاحیت چھین لیتا ہے، کہیں میڈیا شور پیدا کر کے سچ کو دفن کر دیتا ہے، کہیں سیاست خوف کو اقتدار کا زینہ بنا لیتی ہے، اور کہیں معیشت انسان کی عزتِ نفس کو ترقی کے وعدوں کے عوض گروی رکھ لیتی ہے۔

آج بھی جب مسلمان اپنے ہی وطن میں وفاداری کا ثبوت دیتے دیتے تھک جاتے ہیں، جب دلتوں کو صدیوں پرانی غلامی کی زنجیروں سے آزادی کا اعلان کرتے ہوئے بھی نفرت کی صلیب ڈھونا پڑتا ہے، آج بھی جب کسی مسلمان کی داڑھی نوچی جاتی ہے، اس کی لنچنگ کی جاتی ہے یا کسی دلت کے منھ پر پیشاب کیا جاتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ چنگیزیت ماضی کا ایک باب نہیں بلکہ ہمارے درمیان چلتا پھرتا ایک سایہ ہے۔

جہاں بھی کوئی طاقت اپنے آپ کو ماورائے اخلاق اور ماورائے انسانیت قرار دے کر دوسروں پر حکمرانی کا حق مانگتی ہے، وہیں چنگیزیت کی روح پھر سے سانسیں لینے لگتی ہے۔

چنگیزیت صرف ایک تاریخی شخصیت کا ورثہ نہیں، بلکہ اقتدار کی وہ ابدی بیماری ہے جو کبھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوتی، صرف شکل بدلتی ہے۔

چنگیز خان کا وہ جملہ آج بھی تاریخ کے افق پر گونج رہا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب وہ تلوار کے سائے میں نہیں، بلکہ مہذب الفاظ، قانونی اصطلاحات اور عالمی نعروں کے پردے میں دہرایا جاتا ہے۔

اصل خطرہ یہ نہیں کہ کوئی نیا چنگیز خان پیدا ہو جائے، بلکہ اصل خطرہ یہ ہے کہ کہیں ''دو آفتاب نہیں ہو سکتے'' کا تصور ہمارے اجتماعی شعور کا حصہ نہ بن جائے۔ کیونکہ جب طاقت خود کو واحد حق سمجھنے لگے، تو نام بدل جاتے ہیں، دور بدل جاتے ہیں مگر چنگیزیت باقی رہتی ہے۔

روپ بدلتی اس چنگیزیت کا حقیقی توڑ وہی ہے جو اسلام نے صدیوں پہلے پیش کیا تھا؛ عدل و انصاف اور اعلیٰ اخلاق!

آج بھی جب چنگیزیت اپنے خونی پنجے زمین میں گاڑتی ہے، جب ظلم نئے ناموں، نئی زبانوں اور نئی حکمتِ عملیوں کے ساتھ ابھرتا ہے، تو مسلمانوں کی تاریخ امید کی ایک روشن کرن بن کر سامنے آتی ہے۔ جو یقین دلاتی ہے کہ ظلم کا سیلاب کتنی ہی شدت سے کیوں نہ آئے، اسلام کی روشنی اس کی لہروں کو ٹھنڈا کرنا جانتی ہے۔

انصاف کے ساتھ استقامت، اخلاق کے ساتھ مزاحمت، اور ظلم کے مقابل انسانیت کی بلند ترین سچائی؛ یہی وہ قوت ہے جو تلوار کے بغیر بھی دلوں فتح کر لیتی ہیں، جو خوف کے بغیر بھی باطل کو لرزا دیتی ہیں، اور جو تاریخ کو یہ یاد دلاتی ہیں کہ ظلم چاہے کتنے ہی روپ بدل لے، حق کا چراغ بجھایا نہیں جا سکتا!!

☆☆☆

نعتِ پاک ﷺ

نتیجہ فکر
محمد سمعان خلیفہ ندوی

پھر طائرِ حق محوِ سرودِ ازلی ہے
اور میری زباں وقفِ ثنائے نبوی ہے

احساس کی وادی میں رواں نور کی ندیاں
محبوب کی صورت جو نگاہوں میں بسی ہے

ہے دل کے گلابوں میں ترے نام کی خوشبو
انفاس کی لہروں میں ترا ذکرِ خفی ہے

ساقی ترے دربار میں ہو اذنِ حضوری
تجھ سے تو بچھڑ کر مری جاں ہی پہ بنی ہے

فرقت میں مری آنکھ سے بہتے ہیں جو آنسو
یہ اشکِ ندامت ہیں یا موتی کی لڑی ہے

طوفانِ حوادث میں کہیں بجھ ہی نہ جائے
جو آتشِ الفت مرے سینے میں لگی ہے

اے زیبِ جہاں، روحِ صبا، جانِ بہاراں
آمد سے تری محفلِ کونین سجی ہے

اے میرے دل و جان کی اقلیم کے سلطاں
دنیائے محبت ترے قدموں میں بچھی ہے

اے کاش ہو سمعاںؔ ترے جاروب کشوں میں
اشعار کے پیکر میں تمنا یہ ڈھلی ہے

شب وروز

ندوۃ العلماء منزل بہ منزل

محمد زین الحق ندوی (شعبۂ دعوت وارشاد-ندوۃ العلماء)

مشاورتی نشست برائے ائمہ مساجد

زیر اہتمام شعبۂ دعوت وارشاد

(۷/جنوری) ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی کی زیرصدارت ایک روزہ مشاورتی نشست کا انعقاد ہوا جس میں شہر لکھنؤ سے دوسو سے زائد ائمہ مساجد نے شرکت کی۔

مولانا آفتاب عالم خیرآبادی ندوی کی نظامت میں قاری ریاض مظاہری ندوی کی تلاوت قرآن اور محمد فرقان کی نعت پاس سے نشست کا آغاز ہوا۔

تمہیدی گفتگو میں مولانا سید محمد غفران ندوی (ناظر شعبہ دعوت وارشاد) نے شعبہ کا تعارف کرایا اور اس نشست کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آپ کہ آپ ایک عظیم منصب پر فائز ہیں اور ملت کی رہبری کا بہت اہم فریضہ انجام دے رہیں، آپ صرف نماز کے امام نہیں بلکہ ایمان کے اعتبار سے، اخلاق کے اعتبار سے، اعمال کے اعتبار سے آپ اہل محلہ کے لیے آئیڈیل اور رہنما ہیں۔

اس موقع پر مولانا سید عمار حسنی ندوی (ناظر عام) کا کلیدی خطاب ہوا جس میں آپ نے فرمایا کہ آپ سب ائمہ کرام ہیں، یقیناً آپ عظیم منصب پر فائز ہیں، پورے محلہ کے ایک ایک فرد کی دینی رہنمائی کی ذمہ داری آپ پر ہے، آپ جس رخ پر عوام کی رہنمائی کریں گے، عوام اسی رخ پر چلیں گے، اس لیے ضروری ہے کہ آپ نسل نو کے ایمان و اخلاق کی حفاظت کے لیے مکتب کے نظام پر خصوصی توجہ دیں تاکہ نئی نسل دین پر قائم رہے۔

ناظر شعبہ مولانا سید محمد غفران ندوی نے سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ شہر لکھنؤ کی نو سو سے زائد مساجد میں خطاب جمعہ کا اہتمام کیا جا رہا ہے، آٹھ سو سے زائد مساجد میں مکتب کا نظام قائم ہے، تقریباً ڈھائی سو مساجد میں درس قرآن کا سلسلہ جاری ہے۔ پچاس سے زائد مساجد میں تخصصات کے طلباء ہفتہ واری درس قرآن و جمعہ کے خطاب کے لیے جاتے ہیں، اس کے علاوہ اطراف شہر میں بجنور، موہن لال گنج، نگوہاں، جیتی کھیڑا اور اموسی کے علاقہ میں تخصص فی الدعوۃ کے طلباء ہفتہ وار دعوتی و اصلاحی دورہ بھی کرتے ہیں۔

صدر محترم نے اپنے خطاب میں شعبہ دعوت و ارشاد کے بنیادی مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ شعبہ کا بنیادی مقصد مسلمانوں اور خاص کر نئی نسل کے ایمان واخلاق کی حفاظت کرنا ہے۔

آپ نے مزید فرمایا کہ اس وقت ملت اسلامیہ کو جو مسائل درپیش ہیں ان میں ارتداد و الحاد کا مسئلہ بہت ہی اہم اور نازک ہے، اس سے تحفظ کی جو تدبیریں ممکن ہیں ان میں پانچ امور پر کی جانب خصوصی توجہ کی ضرورت ہے؛ جمعہ کے خطابات، مکاتب کا منظم نظم، درس قرآن، خواتین کے لیے دینی وتربیتی اجتماع اور تعلیم بالغان۔ الحمد للہ شعبہ دعوت وارشاد ان کی طرف خصوصی توجہ بھی دیتا ہے۔

اس نشست میں ذمہ داران حلقہ نے اپنے اپنے حلقہ کی رپورٹ پیش کی اور بعض شرکائے نے اپنی آراء بھی پیش کیں۔

فقہی سوال وجواب

از: مفتی محمد طارق ندویؒ

مرتبہ مولانا محمد زبیر احمد ندوی کا اجرا

(۷/جنوری) شعبہ دعوت ارشاد کے تحت منعقد پروگرام برائے ائمہ مساجد میں "فقہی سوال و جواب" کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

سابق معاون مفتی واستاذ دار العلوم ندوۃ العلماء مفتی محمد طارق ندوی صاحبؒ دعوتی ذوق رکھنے والے عالم تھے، کامیاب مدرس تھے اور رواں قلم کے مالک تھے، تقریباً پچیس سال تک "تعمیر حیات" میں سوال و جواب کے کالم کے تحت بنیادی و ضروری مسائل کو "سوال و جواب" کی شکل میں پیش کرتے رہے، مسائل عام ضروریات زندگی سے متعلق ہوتے تھے اور نہایت آسان و سادہ اسلوب میں ہوتے تھے، اس لیے ان سے عوام وخواص دونوں یکساں استفادہ کرتے تھے۔

مولانا محمد زبیر احمد ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء) نے تعمیر حیات کی فائلوں سے انہی سوال جواب کے سارے کالمز کو یکجا کیا، ان مسائل کو فقہی ابواب کے تحت مرتب کیا، حوالوں کی مراجعت کی اور پھر کتابی شکل میں پیش کیا۔

اس اہم پروگرام میں شہر لکھنؤ سے تشریف لائے دوسو سے زائد ائمہ کرام اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ کرام کی موجودگی میں صدر مجلس حضرت مولانا سید بلال عبالحی حسنی ندوی مدظلہ کے بدست مبارک سے اس کتاب کا اجراعمل میں آیا۔

اس موقع پر تشریف فرما اساتذہ کرام اور ائمہ مساجد کو یہ کتاب بطور تحفہ پیش کی گئی۔

صدر محترم کی دعا پر یہ مشاورتی نشست اختتام پزیر ہوئی۔

☆☆☆

فقہی مسائل

سوال وجواب

مفتی محمد ظفر عالم ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

سوال: آج کل لوگ بینک میں ایف ڈی کراتے ہیں اور چار پانچ سال کے بعد تقریباً دوگنی رقم ملتی ہے، تو کیا اس مزید ملنے والی رقم کو دکان و مکان کے لینے میں ایڈوانس یا سلامی یا پگڑی کے طور پر دے سکتے ہیں؟

جواب: سودی رقم پگڑی یا سلامی میں صرف نہیں کی جاسکتی ہے، بلکہ بلا نیت ثواب ضرورت مندوں پر صرف کردینا لازم ہے:

لا يقصد به: أي بالتصدق من المال الخبيث تحصيل الثواب، بل تفريغ الذمة۔

[مجموعة الفتاوی: ۱۴۷/۲]

سوال: آج کل مسلم معاشرہ میں بھی جہاں بہت سی غیر شرعی چیزیں داخل ہوگئی ہیں، وہیں جہیز کا رواج بھی بڑھتا ہی جارہا ہے، بسا اوقات یہ سنگین شکل اختیار کرلیا ہے، بے شمار ایسے والدین ہیں جن کے یہاں جوان بچیاں ہیں اور شادی میں جہیز دینے کا انتظام نہیں ہوتا ہے اور وہ پریشان ہوتے ہیں، ایسے پریشان حال لوگوں کی بچیوں کے جہیز میں سودی رقم لگائی جاسکتی ہے یا نہیں؟

جواب: یقیناً جہیز کا رواج ہمارے مسلم معاشرہ میں بڑھتا جارہا ہے، بسا اوقات گارجین بے حد پریشان ہوتے ہیں، اگر یہ حضرات مالی اعتبار سے فقراء اور ضرورت مندوں میں ہوں تو ان کو سودی رقم دی جاسکتی ہے تاکہ وہ اس رقم سے سامان جہیز خرید لیں، لیکن رقم دینے والے خود سے جہیز خرید کر نہیں دے سکتے، بہتر تو یہی ہے کہ جہیز کا سامان سودی رقم سے نہ دینا چاہیے اور نہ ہی لینا چاہیے، بلکہ اگر جہیز مجبوراً دینا پڑے تو صاحب ثروت رشتہ داروں کو چاہیے کہ اپنے مجبور رشتہ داروں کی مدد کریں اور سودی رقم اس میں دینے سے گریز کریں۔

[فتاویٰ ہندیہ: ۵/۳۴۹]

سوال: کیا سودی رقم انکم ٹیکس کی ادائیگی میں دے سکتے ہیں؟

جواب: سرکاری بینک سے سودی رقم حاصل ہو تو سرکار کی طرف سے لاگو انکم ٹیکس میں اس کو دے سکتے ہیں، کیونکہ اس صورت میں سرکار کی رقم سرکار ہی کے دوسرے محکمہ میں دے کر گورقم لوٹانا ہوتا ہے۔

[ردالمحتار، کتاب الغصب: ۶/۱۸۲]

سوال: ادھار سامان نقد سامان کی قیمت کے مقابلہ میں زیادہ قیمت پر بیچنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: ادھار بیع (خرید وفروخت) میں نقد بیع کے مقابلہ میں قیمت زیادہ کرنا جائز ہے بشرطیکہ معاملہ کرنے والے فریقین معاہدہ کے وقت ہی بیع موجل (ادھار خرید وفروخت) ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں قطعی فیصلہ کرکے کسی ایک ثمن (قیمت) پر متفق ہوجائیں۔

[المبسوط للسرخسی: ۱۳/۷]

سوال: کسی کمپنی کا افتتاح ہوا اور وہ ابتدا ہی میں شیئرز جاری کررہی ہو تو ان کو خریدنا کیسا ہے؟

جواب: کسی کمپنی کا افتتاح ہوا اور وہ ابتدا ہی میں شیئرز جاری کردے تو اس شرط کے ساتھ شیئرز خریدنا جائز ہے کہ جس کمپنی کے یہ شیئرز ہیں وہ کوئی حرام کاروبار شروع نہ کررہی ہو۔

[فقہی مقالات: ۱/۱۴۳]

سوال: اسٹاک مارکیٹ (Stock Market) سے شیئرز خریدنا کیسا ہے؟

جواب: اسٹاک مارکیٹ سے شیئرز خریدنے کے لئے تین شرطوں کا لحاظ کرنا ضروری ہے: ۱۔ کمپنی حرام کاروبار میں ملوث نہ ہو، ۲۔ کمپنی کے تمام اثاثے نقد رقم کی شکل میں نہ ہو، بلکہ اس نے کچھ فکسڈ اثاثہ (Fixed Assets) حاصل کرنے کے لیے ہوں، مثلاً بلڈنگ بنا لی ہو، البتہ اگر تمام اثاثے نقد رقم کی شکل میں ہو تو اصل قیمت (Face Value) سے کم یا زیادہ میں خریدنا جائز نہیں ہے، ۳۔ عموماً کمپنیاں کسی نہ کسی طرح سودی کاروبار میں ملوث ہوتی ہیں، اس لیے یہ ضروری ہے کہ جب منافع تقسیم ہوں تو شیئرز خریدنے والا انکم اسٹیٹ منٹ (Income Statement) کے ذریعہ معلوم کرے کہ کتنا فیصد حصہ سودی ڈپازٹ سے حاصل ہوا ہے تو اب وہ اپنے نفع کا پانچ فیصد حصہ صدقہ کردے۔

[فقہی مقالات: ۱/۱۵۱]

سوال: مضاربت میں اگر خسارہ ہوجائے تو وہ خسارہ کس کے ذمہ ہوگا؟

جواب: مضاربت (ایسا کاروبار جس میں پونجی کسی کی ہو اور عمل ومحنت دوسرے کی ہو) میں اگر خسارہ ہوجائے تو اولاً اسے نفع سے پورا کیا جائے گا اور اگر نفع سے پورا نہ ہو اور نقصان مضارب (کام کرنے والے) کی کوتاہی اور زیادتی کی وجہ سے ہوا ہے تو اس کی ذمہ داری صرف مضارب پر ہوگی، لیکن اگر نقصان مضارب کے قصور اور تعدی کی وجہ سے نہیں ہوا ہے تو نقصان کی پوری ذمہ داری صرف رب المال (پونجی والے) کی ہوگی۔

[تبیین الحقائق: ۵/۶۷]

☆☆☆

ندوة العلماء
پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ، لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷ یوپی (ہند)

NADWATUL-ULAMA
PO. BOX 93, TAGORE MARG, LUCKNOW
226007 U. P. (INDIA)

باسمہ تعالیٰ

تاریخ ۲۵/جنوری ۲۰۲۶ء

Date 25th January 2026

اہلِ خیر حضرات سے

اللہ تعالیٰ کا شکر واحسان ہے کہ حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی سرپرستی میں ندوۃ العلماء اپنی علمی، دینی، تعلیمی وتربیتی خدمات انجام دے رہا ہے، اوران بیش قیمت اصولوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہے جن کے لیے ندوۃ العلماء کو قائم کیا گیا تھا، یعنی جدید زمانہ میں اسلام کی مؤثر اور صحیح ترجمانی، دین ودنیا کی جامعیت اور علم وروحانیت کے اجتماع کی کوشش، فتنۂ لادینیت اور ذہنی ارتداد کا مقابلہ، اسلام پر اعتماد اور اسلامی علوم کی برتری وامتیاز کا اعلان واظہار، دین حق سے وفاداری اور شریعت پر استقامت۔

آپ سے ہماری درخواست ہے کہ وقت کی اس ضرورت اور دار العلوم ندوۃ العلماء کی افادیت کو سمجھتے ہوئے پوری فراخدلی، فیاضی اور ہمت سے کام لے کر ان تمام کاموں میں بھرپور تعاون واعانت فرمائیں کہ ہندوستان میں دین کے قلعوں کی حفاظت کی اس سے بہتر کوئی سبیل اور اس سے زیادہ پائدار کوئی صدقہ جاریہ نہیں۔

لہٰذا آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے صدقات وعطیات چیک یا ڈرافٹ کے ذریعہ اور آن لائن ندوۃ العلماء کے مندرجہ ذیل اکاؤنٹ میں منتقل فرمائیں، ایسے نازک اور مشکل حالات میں ندوۃ العلماء کے ساتھ آپ کا تعاون نہایت اہمیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی کاوشوں کو قبول فرمائے اوران کو ہمارے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین۔

(مولانا ڈاکٹر) تقی الدین ندوی	(ڈاکٹر) محمد اسلم صدیقی	(مولانا ڈاکٹر) سعید الرحمن اعظمی ندوی	(مولانا) محمد عمار حسنی ندوی
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء	معتمد مال ندوۃ العلماء	مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء	ناظر عام ندوۃ العلماء

NADWATUL ULAMA

عطیات	A/c No. 1086 3759 711
تعمیرات	A/c No. 1086 3759 733
زکوٰۃ	A/c No. 1086 3759 766

IFSC CODE : SBIN0000125 - STATE BANK OF INDIA, MAIN BRANCH, LUCKNOW

ONLINE DONATION LINK
https://www.nadwa.in/donation/

نوٹ: چیک/ڈرافٹ پر صرف یہ لکھیں:
NADWATUL ULAMA
اور اس پتہ پر ارسال کریں:
Nizamat office, Nadwatul Ulama,
Tagore Marge, Lucknow - 226007 (U.P.)
معطیان کرام! براہ کرم اپنے عطیات ارسال کرنے کے بعد مندرجہ ذیل نمبر
+91-8736833376
پر مطلع فرمانے کی زحمت کریں، اس سے دفتری کاروائی میں سہولت ہوگی۔
فجزاکم اللہ خیر الجزاء

website : www.nadwa.in
Email : nizamat@nadwa.in

نوٹ: ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دیا گیا تعاون سیکشن 80G انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا